درس ۳۶ تشریح آیات

۷۱ -- تا -- ۸۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ
قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ
فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ
كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ہاں' تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے .... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں .... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔"

یہ اہل ایمان کو نصیحت ہے۔یہ عالم بالا کی قیادت سے ان کے لئے ہدایات ہیں' جن کے اندر ان کے لئے منہاج عمل درج کیا گیا ہے۔مستقبل کا راستہ متعین کیا گیا ہے۔جب انسان قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے' تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لئے معرکہ جہاد کی عمومی اسکیم بھی تیار کرتی ہے۔جنگ کی اسٹریٹیجی بھی قرآن میں درج کی جا رہی ہے۔ایک دوسری آیت میں ہے۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُو ... کُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو جو کفار میں سے تمہارے قریب ہیں۔اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔" اسلامی تحریک کے لئے یہ ایک عام منصوبہ ہے۔اس آیت میں اہل ایمان کو کہا جاتا ہے۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا (۴:۷۱))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" یہ عملی اقدام کی اسکیم کا ایک حصہ ہے جسے ٹیکٹکس کہتے ہیں۔اور سورہ انفال میں بھی بعض ایسی ہدایات دی گئی ہیں جو میدان جنگ کے بارے میں ہیں۔

(فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ) "پس اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید وہ بدعہدی کے انجام سے عبرت پکڑیں۔"

یہ ہے قرآن مجید' اس میں مسلمانوں کو صرف عبادات اور مراسم عبودیت ہی نہیں سکھائے گئے اور نہ اس میں صرف انفرادی اسلامی آداب اور اخلاق ہی سکھائے گئے ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا اس دین کے بارے میں ایسا فقیرانہ تصور ہے بلکہ یہ قرآن کریم لوگوں کی زندگی کو پورے طور پر (As a Whole) لیتا ہے۔ یہ زندگی کے عملی واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر اپنا فیصلہ دیتا ہے۔اور پوری زندگی کے لئے مکمل ہدایات دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک مسلمان فرد اور ایک مسلمان معاشرے سے' اس سے کم کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتی کہ ان کی پوری پوری زندگی اس کتاب کے مطابق بسر ہو۔اس کتاب کے تصرف میں ہو' اس کی ہدایات کے مطابق بسر ہو۔ خصوصاً یہ کتاب کسی مسلمان فرد اور سوسائٹی کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی زندگی کے لئے متعدد نظام اختیار کر لیں جن

کے اصول مختلف ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ذاتی نظام' عبادات اور اخلاق و آداب کا نظام تو وہ کتاب اللہ سے لے لیں' اور اقتصادی' اجتماعی' سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں ہدایات کسی دوسری کتاب یا کسی انسان کے دیئے ہوئے تصورات سے اخذ کر لیں۔ اس کتاب کے مطابق انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی فکر اور تصورات اس کتاب اور اس کے منہاج سے اخذ کرے اور اپنی زندگی کے لئے تفصیلی احکام اس کتاب سے لے کر زندگی کے واقعات پر ان کا انطباق کرے۔ اس لئے کہ زندگی کے اندر مسلسل نئے نئے مسائل اور حالات پیش آتے رہتے ہیں اور یہ احکام وہ اس طرح مستنبط کرے جس طرح اس سبق سے پہلے سبق میں اس کی تفصیلات خود اس کتاب نے دی ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کتاب نے کھلا نہیں چھوڑا اور نہ' نہ ایمان ہو گا اور نہ اسلام۔ سرے سے اسلام اور ایمان ہو گا ہی نہیں اس لئے کہ جو لوگ اس کتاب کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کرتے وہ ایمان اور اسلام میں داخل ہی نہیں ہوتے اور گویا انہوں نے ارکان اسلام کا اعتراف ہی نہیں کیا ہے۔ ان ارکان میں سے پہلا کلمہ شہادت (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی شارع نہیں ہے۔

یہ ہے قرآن کریم جو اس معرکے میں مسلمانوں کے لئے میدان جنگ کا منصوبہ بناتا ہے جو اس وقت ان کے موقف کے ساتھ شامل تھا' اور جو ان کے وجود کے لئے ضروری تھا کیونکہ ان کے اردگرد ہر طرف بے شمار مخالفتیں تھیں' جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ اسلامی مملکت کے اندر یہودی اور منافقین مسلمانوں کے خلاف گہری سازشیں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مومنین کو خبردار کرتے ہیں۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا (۴:۷۱))

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہو' پھر جیسا موقعہ ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" ثبات ثبت کی جمع ہے' یعنی مجموعہ' حکم یہ ہے کہ جہاد کے لئے اکیلے نکلنا جائز نہیں ہے۔ جہاد کے لئے یا تو چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں نکلو یا بڑے لشکر اور فوج کی شکل میں نکلو' جس طرح کا معرکہ درپیش ہو' اس لئے کہ افراد کو دشمن سہولت سے پکڑ سکتا ہے' اور اس وقت دشمن ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت بالخصوص یہ حکم تھا' اس لئے کہ اس دور میں دشمن اسلام کے مرکز میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کی صورت میں کھلے پھرتے تھے۔

(وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَکُنْ مَّعَھُمْ شَھِیْدًا (۷۲) وَلَئِنْ اَصَابَکُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوْلَنَّ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا (۷۳) (۴:۷۲-۷۳))۔

"ہاں تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے...... اور اس طرح

کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں..... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا یا بڑا کام بن جاتا۔"

منظم دستوں کی شکل میں نکلو یا سب کے سب نکلو' یہ نہ ہو کہ تم میں بعض لوگ تو نکلیں اور بعض لوگ سستی کریں۔ جیسا کہ بعض لوگ سستی کر رہے ہیں' اور ہر وقت تیار رہو۔ صرف خارجی دشمن کے مقابلے میں نہیں بلکہ ان اندرونی دشمنوں کے مقابلے میں بھی' ان لوگوں کے مقابلے میں بھی تیار رہو جو پہلوتہی کرتے ہیں' لڑائی سے جی چراتے ہیں اور جو شکست خوردہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جہاد سے روکتے اور سستی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی جنگ سے روکتے ہیں شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں کی عادت بالعموم ایسی ہی ہوتی ہے۔

(لَّيُبَطِّئَنَّ) کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے اس کے اندر ایک قسم کا بھاری پن اور پھسلن پائی جاتی ہے۔ اس کے حروف کی ادائیگی اور صوتی حرکت کے اندر بھی ایک قسم کی پھسلن پائی جاتی ہے۔ اور جب زبان اس کے آخری اور مشدد حرف کو ادا کرتی ہے تو اس میں بھی کھچاؤ ہے۔ ایک لفظ کے ساتھ اس پوری نفسیاتی کشمکش کو ادا کر دیا گیا جو ایسے لوگوں کے ذہن میں ہوتی تھی اور خود لفظ جو اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے استعمال کیا گیا ہے پوری کشمکش اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس طرح مفہوم بھاری ہے اس طرح لفظ بھی بھاری استعمال کیا گیا ہے اور یہ وہ کمال درجے کا اسلوب ادا ہے جو صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ ((دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن' فصل تناسق)) اس لفظ کے بعد پھر (وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) کے پورے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح سست روی کا شکار ہیں' یہ لوگ معدودے چند ہیں اور ان کو اس پہلوتہی پر پوری طرح اصرار ہے۔ وہ اس میں سخت کوشاں ہیں اور یہ بات ان تاکیدی حروف سے معلوم ہوتی ہے جو اس فقرے میں استعمال ہوئے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ اپنے رویے پر مصر ہے اور اسلامی محاذ پر اس کا اثر پڑ رہا ہے اور بہت برا اثر ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں کرتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔ ان کی قابل نفرت حقیقت کی خوب تصویر کشی کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا عجیب معجزانہ انداز ہے۔

یہ لو' یہ لوگ تمہارے سامنے ہیں' اپنے پورے ارادوں کے ساتھ' اپنے مکمل مزاج اور اپنے اقوال و افعال کے ساتھ' بالکل سامنے' آنکھوں کے سامنے بالکل ننگے کھڑے ہیں۔ گویا انہیں مائیکرو اسکوپ کے نیچے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ اندرونی مائیکرو اسکوپ ان کے دلی رازوں کا افشا کر رہا ہے اور ان کے تمام اغراض و مقاصد اس سے واضح ہو رہے ہیں۔

دیکھو یہ لوگ ہیں' جو عہد رسول اللہ ﷺ میں نظر آتے ہیں اور آپ کے عہد کے بعد ہر زمان و مکان میں یہ قسم یوں ہی باقی رہے گی۔ یہ کیا ہیں؟ کمزور' منافق اور آئے دن بدلنے والے' جن کے مقاصد نہایت ہی چھوٹے ہیں' نہایت پیش پا افتادہ' جو اپنے ذاتی مفادات اور شخصی فائدے سے اعلیٰ کسی اور فائدے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اپنی شخصیت سے اونچے افق کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے' یہ لوگ پوری دنیا کو ایک ہی محور کے گرد گھماتے ہیں اور یہ محور ان کی ذات اور ذاتی مفادات کا محور ہے' اسے وہ کبھی نہیں بھولتے۔

یہ لوگ سست اور ڈھیلے ہیں اور آگے بڑھنے والے نہیں ہیں کہ اپنے اصل مقام پر جا کھڑے ہوں' اور نفع و نقصان

کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ گھٹیا درجے کے منافقین کے لائق ہے۔

یہ لوگ معرکہ جہاد سے پیچھے رہنے والے ہیں' اگر مجاہدین پر مصیبتیں آجائیں اور وہ مبتلائے مشکلات ہو جائیں جس طرح اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے تو یہ پسماندہ لوگ بہت ہی خوش ہوتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جہاد سے ان کا فرار اور مشکلات سے ان کا بچ نکلنا ان کے لئے مفید ہے۔

(فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا

(۴:۷۲)) (اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا)

ایسے لوگوں کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ وہ بزدلی کی اس زندگی کو اللہ کی نعمت تصور کرتے ہیں اور پھر وہ اسے اس اللہ کا فضل کہتے ہیں جس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ لوگ پیچھے بیٹھ گئے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی بچ بھی نکلے تو وہ کبھی نعمت خداوندی نہیں پا سکتا کیونکہ اللہ کی نعمت اللہ کے حکم کی خلاف ورزیاں کر کے نہیں ملتی اگرچہ بظاہر وہ صاحب نجات نظر آئیں۔

یہ بے شک ایک نعمت ہو گی مگر ان لوگوں کے نزدیک جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ نہیں کرتے۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک بچنا ہے جو یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اور وہ اطاعت کر کے اور جہاد کر کے اللہ کی غلامی نہیں کرتے تاکہ وہ اسلامی نظام حیات کو دنیا میں قائم کریں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جن کی نظریں اپنے قدموں کے آگے بلند آفاق پر نہیں پڑ سکتیں۔ یہ چیونٹیوں کی طرح کے لوگ ہیں' یہ نجات ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جو اس بات کا احساس نہیں رکھتے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کی مشکلات برداشت کرنا اسلامی نظام کے قیام کے لئے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور یہ اللہ کا خصوصی انتخاب ہے جس کے ذریعے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ دنیا کی اس زندگی میں بشری کمزوریوں پر قابو پائیں۔ اس طرح وہ انہیں دنیا کی قید سے رہائی دلاتا ہے۔ وہ ایک برگزیدہ زندگی پر فائز ہو جاتے ہیں' وہ زندگی کے مالک ہو جاتے ہیں اور زندگی ان کی مالک نہیں ہوتی۔ تاکہ یہ آزادی اور یہ سربلندی ان کو ان بلندیوں تک لے جائے جو آخرت میں شہداء کے لئے مقرر ہیں۔ بے شک سب لوگ مرتے ہیں لیکن اللہ کی راہ میں جان دینے والے ہی شہید ہوتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل عظیم ہے۔

اگر صورت حال دوسری پیش آجائے اور مجاہدین کامیاب ہو جائیں' وہ جو یہ تیاری کر کے نکلے تھے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو پیش آتا ہے' آئے اور انہیں اللہ کا فضل نصیب ہو جائے' فتح اور غنیمت کی صورت میں تو یہ پیچھے رہنے والے لوگ سخت نادم ہوتے ہیں کہ وہ کیوں نہ اس نفع بخش معرکے میں شریک ہوئے۔ اس فائدے میں ان کے نزدیک نہایت ہی گھٹیا معیار ہوتا ہے' خالص دنیاوی معیار۔

(وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ

كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴:۷۳))

(اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے .... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں .... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔)

یہ نہایت ہی گھٹیا خواہش ہے محض مال غنیمت کی خواہش ' اور اسے یہ شخص فوز عظیم سے تعبیر کرتا ہے۔ مومن بھی مال غنیمت کے ساتھ واپسی کو برا تو نہیں سمجھتا بلکہ اس سے توقع تو یہی ہے کہ وہ بھی اللہ سے ایسی کامیابی مانگے۔ اور مومن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ مشکلات کی طلب کرے بلکہ مطلوب تو یہ ہے کہ وہ عافیت کی دعا کرے۔ مومن کا مجموعی تصور ان متخلفین کے تصور سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے تصور کو قرآن کریم نہایت ہی مکروہ صورت میں پیش کرتا ہے جو قابل نفرت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن بھی مشکلات اور مصائب کی تمنا نہیں کرتا بلکہ عافیت کا طلبگار ہوتا ہے لیکن اسے جب جہاد کی طرف بلایا جائے تو وہ بوجھل قدموں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتا۔ جب وہ نکلتا ہے تو وہ دو اچھے انجاموں میں سے ایک کا طالب ہوتا ہے یا نصرت و کامرانی کا یا شہادت فی سبیل اللہ کا اور یہ دونوں ہی اللہ کے فضل میں سے ہیں اور دونوں ہی فوز عظیم ہیں۔ اہل ایمان کی قسمت میں یا تو شہادت آجاتی ہے تو پھر بھی وہ راضی برضا ہوتے ہیں اور اس گروہ میں جاتے ہیں جو شہادت کے مقام پر فائز ہوا۔ یا وہ زندہ مال غنیمت کے ساتھ واپس آتا ہے تو اس صورت میں وہ اللہ کے فضل پر شکر گزار ہوتا ہے اور اس کی جانب سے آئی ہوئی فتح پر خوش ہوتا ہے مگر یہ خوشی محض زندہ بچ جانے کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

یہ ہے وہ اعلیٰ افق جس کے بارے میں اللہ کا ارادہ ہے کہ اہل ایمان اپنی نظریں اس پر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان میں سے اس فریق کی تصویر ان کے سامنے کھینچتے ہیں اور یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ تمہاری صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو جہاد سے پہلوتہی کرنے والے ہیں اور یہ انکشاف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اہل ایمان ان سے چوکنے رہیں جس طرح وہ ظاہری دشمنوں سے چوکنے رہتے ہیں۔

اس طرح متنبہ کرنے اور اس دور میں جماعت مسلمہ کو مواقع عبرت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم ایک ایسے انسانی ماڈل کا ایک عام نمونہ یہاں منقش کرتا ہے ' جو ہر دور اور ہر جگہ بار بار سامنے آتا رہتا ہے اور یہ تصویر کشی قرآن مجید چند الفاظ کے اندر کرتا ہے۔

یہ حقیقت جماعت مسلمہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے اس لئے کہ اسلامی حلقوں کے اندر ہمیشہ ایسے لوگ پائے جا سکتے ہیں۔ جماعت کو ایسے لوگوں کی حرکات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی تیاری کو ہر حال میں مکمل رکھنا اور آگے بڑھنا چاہئے۔ ہر وقت تربیت ہدایت اور جہد مسلسل کے لئے تیار رہنا چاہئے تاکہ جماعت تمام نقائص سے پاک ہو۔ اپنی کمزوریوں کا مداوا ہر وقت ہوتا رہے اور جماعت کے عملی اقدامات ' اس کے نظریات اور اس کی تمام حرکات کے درمیان باہم ربط ہو۔

---ooo---

اب اگلی آیت میں یہ سعی کی جاتی ہے کہ یہ سست رو ' پہلوتہی کرنے والوں اور دنیاوی گندگیوں میں آلودہ لوگوں کو قدرے اٹھایا جائے اور ان کے حس و شعور میں اس دنیا سے آگے آخرت کا شعور پیدا کیا جائے۔ ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا کو فروخت کر کے آخرت کو خریدنے والے بنیں ' اور اس کام میں انہیں دو اچھے انجاموں میں سے ایک

ضرور نصیب ہو گا یا تو فتح و نصرت سے ہمکنار ہوں گے یا شہادت ان کو نصیب ہو گی۔

(فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (٤ : ٧٤))

"(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں' پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس لئے مومنین کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے' اسلام ماسوائے اس کے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کی جائے' کسی اور جنگ کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس لئے جنگ نہ کی جائے کہ مصنوعات کے لئے خام مال فراہم کیا جائے' نہ اسلام غنیمت کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ اقتدار کے حصول کے لئے اجازت دیتا ہے' نہ وہ ذاتی اور قومی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ ملکوں کو فتح کرنے کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ لوگوں کو غلام بنانے کے لئے اجازت دیتا ہے' اور نہ اسلام' کسی ایسی جنگ کی اجازت دیتا ہے جو منڈیوں کے حصول کے لئے لڑی جائے' اور نہ اسلام کی جنگ اس بات کے لئے ہے کہ نو آبادیاتی علاقوں میں سرمایہ لگا کر مفادات حاصل کئے جائیں۔

اسلام ذاتی برتری کے لئے جنگ کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کسی خاندان کی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی طبقے اور کسی حکومت کی برتری کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی قوم اور نہ کسی نسل کی برتری کے لئے اسلام لڑتا ہے۔ اسلام صرف اللہ کی راہ میں جنگ کی اجازت دیتا ہے' اور زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر تمام انسانوں کی زندگی کو اللہ کا نظام کنٹرول کرے۔ انسانیت اس نظام کی برکات سے لطف اندوز ہو اور یہ نظام تمام انسانوں کے درمیان بے قید عدل و انصاف جاری کرے لیکن اس نظام کے تحت ہر شخص کو عقیدے اور نظریے کی مکمل آزادی ہو۔ یوں اس ربانی' انسانی اور عالمی نظام حیات کے تحت لوگ زندہ رہیں۔

جب ایک مسلمان اللہ کے راستے میں لڑنے کے لئے نکلتا ہے' اور یہ لڑائی وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کرتا ہے اور زندگی میں اسلامی نظام حیات کی حکمرانی کے لئے لڑتا ہے اور پھر وہ قتل ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک مقام شہداء پر فائز ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس مقصد کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر لڑتا ہے تو وہ کسی صورت میں بھی شہید نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لئے کوئی اجر اور صلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صلہ ان مقاصد کے زعماء کے پاس ہوتا ہے۔ جو لوگ ایسے لوگوں کو شہداء کہتے ہیں وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے ساتھ تقدس دیتے ہیں جس کی ساتھ اللہ کسی کو مقدس نہیں بناتا۔ یہ اللہ پر ایک افتراء کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لہٰذا اللہ کے راستے میں صرف اس ایک مقصد کے لئے لڑنا جائز ہے۔ اور یہ لڑائی وہ لوگ کرتے ہیں جو دنیا فروخت کر کے آخرت خریدتے ہیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم انتظار میں ہے۔ دونوں حالتوں میں ان پر فضل ہے۔ اگر وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو بھی فضل ہے اور اگر وہ اللہ کی راہ میں غالب ہو جائیں تو بھی اللہ کا فضل ہے۔

(وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (۴:۷۴))

"پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس طرح قرآنی نظام حیات ان نفوس قدسیہ کو بلند کرتا ہے اور وہ دونوں حالتوں میں اللہ کے عظیم فضل کے امیدوار ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ کی راہ میں موت اور جان دینا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا کے مال غنیمت کے حصول کی امید سے بھی بالا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ پوری کی پوری زندگی اور مال غنیمت کے بڑے بڑے ڈھیر بھی اللہ کے فضل عظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ مختصر ٹچ 'انسان کے دلوں میں اس سودے کے خلاف نفرت پیدا کر دیتا ہے جس میں کوئی شخص آخرت کے مقابلے میں دنیا کو خریدتا ہے۔ لفظ یشرون متضاد الفاظ میں سے ہے جو خرید کے معنی میں بھی آتا ہے اور فروخت کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیادہ تر یہ فروخت کے معنی میں آتا ہے' تو یہ سودا نہایت ہی خسارے کا ہو گا چاہے انہیں دنیا میں مال غنیمت ملے یا نہ ملے اس لئے کہ دنیا کا آخرت سے کیا مقابلہ ہے اور مال غنیمت کے حقیر مال کا اللہ کے فضل عظیم کے ساتھ کیا مقابلہ ہے۔ اللہ کے فضل میں مال بھی شامل ہے اور مال کے علاوہ دوسرے اکرام اور انعام بھی شامل ہیں۔

اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور جی چرانے والوں کی تصویر کشی کے انداز کو اب چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مروت اور جوانمردی کو ابھارا جاتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر احساس فرض پیدا کیا جاتا ہے۔ اس دنیا اور جزیرۃ العرب میں زیردست لوگوں کے حالات پر غور کرو۔ مرد' عورتیں اور بچے جو مکہ مکرمہ میں مشرکین کے ہاتھوں مظالم سہ رہے ہیں اور ان کے اندر اس قدر قوت بھی نہیں ہے کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں اور فرار اختیار کر کے اپنے دین اور نظریات کو بچالیں۔ وہ آزادی کی آس لئے ہوئے ہیں اور ہروقت دست بدعاء رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں اس گاؤں سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں۔ اس صورت حال کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کر کے انہیں بتاتا ہے کہ تمہاری جنگ بلند مقاصد کے لئے ہے۔ تمہارے اہداف بلند ہیں' اور یہ جنگ جس کے لئے تمہیں نکلنے کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے مقاصد نہایت ہی اونچے مقاصد ہیں۔ اس لئے انہیں اس کی طرف بوجھل قدموں سے نہ نکلنا چاہئے۔ یہ پکار نہایت ہی تاکیدی اور برانگیختہ کرنے کے انداز میں ہے۔ اور سستی اور پیچھے رہنے کو بہت ہی برا سمجھا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

قتال فی سبیل اللہ میں سستی کرنے کا تمہارے لئے کیا موقعہ ہے جبکہ ان مجبور اور ضعیف مردوں' عورتوں اور بچوں کا آزاد کرانا تمہارے فرائض میں سے ہے۔ یہ لوگ جو قابل رحم حالت میں ہیں اور جن کی تصویر کشی قرآن کریم نہایت ہی اثر آفریں الفاظ میں کرتا ہے جس پر مسلمانوں کی حمیت جوش میں آتی ہے۔ مسلمانوں کی عزت نفس جوش میں آتی ہے اور انسانی رحم اور ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں' اس لئے کہ یہ لوگ شدید سے شدید تر مظالم کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے بھی کہ ان پر یہ مظالم محض ان کے نظریات کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ ان کے دین کی وجہ سے انہیں مبتلائے مصیبت کیا جارہا ہے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ غرض نظریات اور دین کی وجہ سے جو مصائب آتے ہیں وہ جان و مال کی وجہ سے آنے والے مصائب سے زیادہ شدید اور سخت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مصائب انسان پر انسانی خصوصیات کی وجہ سے آتے ہیں۔ اور انسان کی عزت نفس' اس کی عزت اور اس کے حق ملکیت وغیرہ کے حوالے سے مصائب کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

ایسی عورت کی تصویر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو' ایسے بچوں کے مناظر جو نحیف و ناتواں ہوں' ایک ایسا منظر ہے جو جذبات کے اندر تلاطم پیدا کر دیتا ہے' خصوصاً وہ ضعیف لوگ اور بوڑھے جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور خصوصاً ایسے حالات میں جب اس دفاع کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو۔ یہ منظر ایسے وقت میں دکھایا جاتا ہے جس میں جہاد کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں جہاد کے لئے نہ اٹھنا نہایت ہی مکروہ فعل ہو گا' جبکہ مظلوموں کی یہ چیخ و پکار سنی جا رہی ہو۔ یہ ایک ایسا اسلوب بیان ہے جو دلوں کو پگھلا دیتا ہے اور انسانی شعور اور احساس کے اندر گہرائی تک اتر جاتا ہے۔

لہذا ایک نظر اس پہلو پر بھی ڈالیں کہ اسلامی تصور کے مطابق ملک و وطن کی حیثیت کیا ہے۔ یہاں ملک اور بلدہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔ (الظَّالِمِ اَهْلُهَا) جس کے لوگ ظالم ہیں' یہ اسلام کے نزدیک دارالحرب ہے۔ اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس ملک کے ساتھ کمزور مسلمانوں اور ان کے بیوی بچوں کو چھڑانے کے لئے جنگ کریں۔ اور یہ وطن مکہ ہے جو مہاجرین کا اصلی وطن تھا اور ان مہاجرین کو پرجوش دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس ملک کے خلاف جنگ کریں اور ضعیف مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پاتے ہی اس ظالم ملک سے نکل آئیں۔

یہاں اس علاقے اور ملک کا مہاجرین کا وطن اصلی ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور اس وجہ سے اسلامی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی' جب کہ اس میں اللہ کی شریعت بھی نافذ نہیں ہے۔ وہ اسلامی نظام حیات کے تحت نہیں ہے جس میں مومنین کو ان کے ایمان کی وجہ سے فتنوں اور مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے اور ان پر محض ان کے عقیدے کی وجہ سے مظالم ڈھائے جاتے ہیں بلکہ خود ان اصلی باشندوں کے نقطہ نظر سے یہ ملک دارالحرب بن گیا ہے۔ وہ اپنے اس اصل وطن کی مدافعت نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ خود اپنے اصل ملک کے خلاف اس لئے جنگ کرتے ہیں کہ وہاں سے اپنے مومن بھائیوں کو نکال لیں۔ غرض مسلمان کا جھنڈا وہ ہوتا ہے جو اس کے عقیدے کا جھنڈا ہوتا ہے اور ایک مسلمان صرف ایک جھنڈے کی حمایت کرتا ہے۔ اس کا وطن جس کے لئے وہ لڑتا ہے وہ وطن ہے جس میں اسلامی نظام

تربیت نافذ ہو' اور اس کی وہ سرزمین جس کا وہ دفاع کرے گا وہ سرزمین ہے جو دارالاسلام ہے اور جس میں اسلامی شریعت اور اسلامی نظام جاری و ساری ہو۔ اس کے علاوہ کسی وطن کے بارے میں جس قدر تصورات ہیں وہ غیر اسلامی اور جاہلی تصورات میں اور اسلام ان تصورات کو ہرگز نہیں پہچانتا۔

اب ایک دو سرا نچ اس موضوع کو دیا جاتا ہے' ہمتوں کو تازہ کرنے کا ایک اور موقع ہے' عزائم میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک نئی راہ میں روشنی کے قمقمے چمک اٹھتے ہیں۔ مقاصد' مفادات اور اقدار حیات کی ایک نئی تعریف (Definition) سامنے آتی ہے۔ ہر ایک گروہ اپنی اقدار کے لئے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا ﴿۷۶﴾

"جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔" اچانک تمام انسان ایک دوراہے پر آکھڑے ہوتے ہیں' اہداف و مقاصد متعین ہو جاتے ہیں' خطوط واضح ہو جاتے ہیں اور لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں' دو ممتاز جھنڈوں کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۴ : ۷۶)) "جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔" اور (وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (۴ : ۷۶)) "اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔"

اہل ایمان کی صف آرائی اللہ کی راہ میں ہے اور وہ اللہ کا نظام حیات نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اللہ کی شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں' وہ اللہ کے نام پر لوگوں کے درمیان قیام عدل چاہتے ہیں' وہ اللہ کے سوا کسی اور نام اور عنوان سے بات نہیں کرتے۔ وہ اس بات کا اعتراف کر چکے ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے اس لئے وہی حاکم ہے۔

اور اہل کفر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' یہ مختلف قسم کے طاغوتی نظامہائے زندگی کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ تمام طاغوتی نظام خدائی نظام زندگی کے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا قانونی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔ وہ ایسی اقدار کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جائز نہ ہوں۔ وہ ایسے پیمانوں سے اقدار حیات کو ناپتے ہیں جو اللہ کی میزان میں کوئی وزن نہیں پاتے۔

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی حمایت اور رعایت اور نگہبانی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کا مددگار شیطان ہوتا ہے اور شیطان کے جھنڈے مختلف ہوتے ہیں' طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ قوانین مختلف ہوتے ہیں' اقدار اور پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ شیطان کے ساتھی

ہوتے ہیں۔

(فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (۴:۷۶)) "پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔"

یوں مسلمانوں کا موقف ایک پختہ جگہ پر ہوتا ہے اور ان کا تکیہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ مضبوط اساس پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک مضبوط سہارا لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا وجدان اور شعور پختہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی جنگ ہے اور اس میں ان کی ذات کا کوئی حصہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد مضمر ہے۔ نہ اس میں ان کی قوم' ان کی نسل' ان کے رشتہ داروں اور ان کے خاندان کا کوئی مفاد ہے۔ یہ صرف اللہ کے لئے ہے' اس کے نظام کے لئے ہے اور اس کی شریعت کے لئے ہے۔ پھر ان کا یہ شعور بھی پختہ ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ اہل باطل سے ہے' اور ان کے مقابل باطل کو حق پر غالب کرنا چاہتے ہیں' اس لئے کہ وہ انسانوں کے جاہلی معاشروں کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور یہ کہ تمام انسانی نظام جاہلی نظام ہوتے ہیں۔ صرف اللہ کی شریعت برحق نظام ہے۔ جبکہ وہ شریعت کو مغلوب کر کے انسانی قانونی نظام رائج کرتے ہیں اور انسانی قانون کے مطابق فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔ ہر وہ فیصلہ ظلم ہے جو انسانی قانون کے مطابق ہو۔ یہ اللہ کے قانون کے ساتھ ظلم ہے' کیونکہ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ فیصلے اس کی شریعت کے مطابق ہوں۔

یہ اہل ایمان جب میدان جنگ میں اترتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ اترتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی اور مددگار ہے۔ وہ یہ شعور رکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی قوت سے لڑنے جا رہے ہیں جس کا مددگار شیطان ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ شیطان کی تمام چالیں بمقابلہ رحمان ضعیف ہوتی ہیں۔

یہاں اگر ایک مومن کے احساس اور شعور میں اس معرکے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کا انجام متعین ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ایک مومن اس معرکے میں قدم رکھتا ہے۔ اب اگر مومن اس معرکے میں شہید ہو جاتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا رہے گا اور اگر وہ نصرت پاتا ہے اور اس معرکے میں اسے غلبہ نصیب ہوتا ہے تو اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ اجر عظیم سے نوازے گا۔

اس مسئلے کے اس حقیقی فہم و ادراک ہی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت کے ہاتھوں وہ معجزات سرزد ہوئے جو اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں اور صحابہ کرام کے بعد بھی مختلف نسلوں میں جابجا اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان کے کچھ نمونے پیش کریں' کیونکہ یہ تو بہت ہی مشہور ہیں۔ یہی تصور تھا جس کے نتیجے میں اسلام کو وہ حیران کن پھیلاؤ نصیب ہوا' اور یہ پھیلاؤ تاریخ کے مختصر ترین عرصے کے اندر واقعہ ہوا۔ یہ تصور اس برتری کا ایک پہلو تھا' جو اسلامی نظام حیات کی وجہ سے امت مسلمہ کو نصیب ہوئی اور یہ برتری اسے اس وقت کے برسرپیکار دونوں بلاکوں کے مقابلے میں نصیب ہوئی اور اس برتری کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ اس تصور اور ادراک کی نشوونما اس مہم کا ایک حصہ تھا جو قرآن کریم کے پیش نظر تھی۔ یہ مہم اہل ایمان کی نفسیاتی دنیا میں بھی جاری تھی اور ان دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی جاری تھی' جس میں اہل ایمان' اپنے مقابلے میں آنے والی فوجوں کی

تعداد اور سازوسامان کے حوالے سے بہت ہی زیادہ قوت کے ساتھ برسرپیکار تھے - دشمن کو اس عظیم تعداد اور سازوسامان کے باوجود شکست ہوئی - اس لئے کہ وہ تصور حیات کے لحاظ سے تہی دامن تھا -

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ قرآن کریم نے اس تصور کی نشوونما اور اس کی پختگی کے لئے کس قدر جدوجہد کی - یہ کام کوئی آسان کام نہ تھا - یہ صرف ایک بات نہ تھی جو زبانی طور پر کہہ دی جاتی - یہ تو جہد مسلسل تھی - اس میں انسان کی ذاتی تنگ دلی' ہر قیمت پر زندہ رہنے کی حرص اور نفع و نقصان کے بارے میں غلط تصورات کے خلاف مسلسل جدوجہد کی گئی - اس سبق میں اس جہد مسلسل کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ فرمائیں -

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام میں' مسلمانوں کے کئی طبقات کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے - (کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مہاجرین تھے) یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو وہ کفار کے مقابلے کے لئے اپنے اندر جوش و خروش رکھتے تھے' اس لئے کہ مکہ میں ان پر ناقابل برداشت مظالم ہو رہے تھے - اس جوش و خروش کے نتیجے میں وہ مکہ میں جہاد و قتال کی اجازت چاہتے تھے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجازت نہ تھی - لیکن جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور ان پر جہاد و قتال من جانب اللہ فرض ہو گیا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اب ان کے لئے جہاد و قتال میں نہایت خیر و برکت ہے تو اب ان کی تصویر کشی قرآن نے ان الفاظ میں کی "تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ تھا کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بڑھ کر' کہتے ہیں خدایا یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟" اور یہ لوگ وہ تھے کہ اگر ان کو کوئی بھلائی نصیب ہوتی تو کہتے یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی مصیبت درپیش ہوتی تو رسول اللہ ؐ سے کہتے کہ یہ آپ کی جانب سے ہے - اور ان میں سے ایسے بھی تھے کہ جب رسول اللہ کے سامنے ہوتے تو جی ہاں کہتے' لیکن جب آپ سے علیحدہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی مجلسوں میں کچھ اور باتیں کرتے - اور بعض ایسے تھے کہ اگر کوئی اطمینان بخش یا خوفناک بات سنتے تو اسے فوراً پھیلا دیتے -

قرآن کریم ایسے لوگوں کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا اپنا مخصوص اسلوب اظہار ہے' جس کے اندر انسان کی لطیف نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے - ان اندرونی نفسیات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ گویا چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں - ایسے لوگوں کی سوچ میں موت و حیات' قضا و قدر' خیر و شر' نفع و ضرر' فائدے اور خسارے' اقدار و پیمانوں کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں جو غلطی اور کجی تھی اسے درست کیا گیا - اور قرآن کے مخصوص اور نہایت ہی موثر اور اشاراتی انداز اور اسلوب میں اسے بیان کیا گیا - ذرا ملاحظہ ہو -

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا

فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا
رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ
مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾
اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ
وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ
سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ
الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ
رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ
اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا
بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ
مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ
اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا

بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْھُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت' تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔ کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے' اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمد ؐ ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔"

آیات کے ان چار پیروں میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نشاندہی کی گئی ہے اور ممکن ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں جن کے بارے میں اس سبق کے سابقہ پیراگراف میں یہ کہا گیا تھا۔ (وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) اور یہ لوگ منافق تھے' اور ممکن ہے کہ یہ تمام ریمارکس ان منافقین کے بارے میں ہوں' جن سے یہ افعال سرزد ہوتے تھے اور وہ

ایسی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔

ہم اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں' اس لئے کہ ان آیات میں جن لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں نفاق کے خدوخال زیادہ نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں منافق موجود تھے اور ایسے افعال اور اس قسم کے اقوال صرف منافقین ہی سے صادر ہونا قریب الفہم ہے جو ان کے مزاج اور سابقہ کردار کے مطابق ہے۔ اگرچہ ان پیراگرافوں کے انداز بیان باہم دگر گڈمڈ ہے..... تاہم ان میں سے پہلا پیراگراف جس میں کہا گیا ہے۔ (قِيلَ لَهُمْ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَ أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ (۴: ۷۷)) ہمیں تردد میں ڈال دیتا ہے کہ آیا یہ تمام پیراگراف صرف منافقین کے بارے میں ہیں۔ اگرچہ منافقین کے اندر بھی یہ صفات موجود تھیں اور اس کے باوجود کہ یہ آیات دوسری آیات سے ملی جلی ہیں اور طرز ادا بھی ایک ہی نظر آتا ہے۔ تاہم میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ پیراگراف مہاجرین کے ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو منافق تو نہ تھا مگر ضعیف الایمان تھا۔ اور ضعف ایمانی کا آخری درجہ بہرحال نفاق کے قریب ہو جاتا ہے۔ رہے دوسرے تین پیراگراف تو غالب یہی ہے کہ ان میں منافقین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر گھسے ہوئے تھے' لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام پیراگراف منافقین ہی کے بارے میں ہوں جو ایسے کام اور ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔

ہم نے یہ موقف کیوں اختیار کیا ہے کہ ان آیات کے پہلے پیراگراف سے مراد یا تو ضعیف الایمان مہاجرین ہیں اور یا ایسے لوگ ہیں جو ایمان کے اعتبار سے پختہ کار نہ تھے اور ان کے دلوں کے اندر ایمان کے نشانات اچھی طرح واضح اور پختہ نہ ہوئے تھے؟ اور ان کی ایمانی فکر مضبوط نہ ہوئی تھی؟

اس موقف کی وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کے بعض گروہ مکہ مکرمہ میں لڑنے کے لئے نہایت ہی پرجوش تھے اور اس وقت لڑائی کی اجازت نہ تھی اور حکم یہ تھا۔ (كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (۴: ۷۷))

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جن ۷۲ افراد نے حضور ؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انہوں نے حضور ؐ کو پیش کش کر دی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آج ہی منی میں موجود کفار پر ٹوٹ پڑیں۔ اس پر حضور اکرم ؐ نے ان کو جواب دیا تھا کہ : "مجھے ابھی تک جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔" اس واقعہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے پیراگراف سے جو لوگ مراد ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اگلے تین پیراگراف آتے ہیں یعنی منافقین۔ کیا یہ بیعت عقبہ ثانیہ والے لوگ ضعیف الایمان ہو سکتے ہیں' جیسا کہ پہلا پیرا بیان کر رہا ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ ان سابقین انصار سے بھی اسلامی تاریخ میں کسی کمزوری کا صدور منقول نہیں ہے۔ نہ کمزوری' نہ نفاق اس لئے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا تھا۔

اس لئے اقرب الی الذہن یہی ہے کہ اس پہلے مجموعہ سے مراد ضعیف مہاجرین ہی ہیں۔ یہ لوگ مدینہ جا کر پرامن زندگی کے خوگر ہو گئے تھے۔ ان سے مشکلات دور ہو گئی تھیں اور جب جہاد و قتال فرض ہو گئے تو وہ ان مشکلات کے برداشت میں کمزوری دکھانے لگے۔ اور یہ بات بھی اقرب الی الذہن ہے کہ دوسرے تین پیراگرافوں کے اندر بیان کردہ اوصاف ان کمزور اہل ایمان مہاجرین کے نہ ہوں بلکہ وہ منافقین کے اوصاف ہوں۔ اس لئے کہ اگرچہ انسان بشری

کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتا پھر بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم کسی مہاجر مومن کی طرف یہ بات منسوب کریں کہ وہ اگر مشکلات سے دوچار ہوں تو ان کو حضرت نبی اکرم ؐ کی جانب منسوب کرے اور بھلائی آپ ؐ کی طرف منسوب نہ کرے اور یہ کہ کوئی مہاجر مومن منہ پر حضور ؐ کی اطاعت کا دم بھرے اور گھر جاکر سازشیں کرے۔ہاں اگرچہ یہ ممکن تھا کہ کوئی نافہمی کی وجہ سے اچھی اور بری خبر کو پھیلا دے لیکن اس سے بھی اس بات کا اظہار ہو گا کہ یہ لوگ نظام جماعت کو اچھی طرح نہیں سمجھے 'لیکن اس اشاعت پر بھی کسی کو منافق نہیں کہا جاسکتا۔

بہرحال ان آیات پر غور کرنے سے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان آیات کی تفسیر میں جو روایات وارد ہیں ان میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کی گئی حتیٰ کہ پہلے پیراگراف کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے وارد نہیں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس سے مہاجرین کا ایک گروہ مراد ہے۔اور بعض میں ہے کہ اس سے مراد بھی منافقین تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں محتاط موقف اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ہم مہاجرین کو جنگ میں پہلوتہی کرنے اور مسلمانوں کو پہنچنے والے مصائب سے دامن بچانے کے اوصاف سے متصف نہیں کر سکتے جس طرح ان پیراگرافوں سے سابق آیات میں آیا ہے۔ نیز ہم ان پر یہ الزام بھی عائد نہیں کر سکتے کہ وہ رسول اللہ ؐ کی طرف برائی کی نسبت کر سکتے ہیں' اور بھلائی کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور یہ کہ وہ رات کو حضور ؐ کے خلاف کوئی مشورہ کر سکتے ہیں 'اگرچہ سیاق کلام اور قرآن کریم کے عمومی انداز بیان سے کسی واقف شخص کے لئے ان پیراگرافوں کا اس انداز سے تجزیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تجزیہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے ایک عرصے تک قرآن کریم پر غور و خوض کیا ہو۔اور قرآن کریم کے اسلوب بیان سے خوب واقف ہو۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۷) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴:۷۷-۷۸))

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر 'کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہت زیادہ بہتر ہے۔اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔رہی موت 'تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو"۔

ان لوگوں کے حال پر اللہ تعالیٰ تعجب کا اظہار فرماتے ہیں۔ یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو لڑنے کے لئے پرجوش تھے ' وہ بہت جلد جہاد شروع کرنے والے تھے۔ اس وقت مشرکین کی طرف سے ان کے خلاف مظالم ڈھائے جا رہے تھے ' وہ فتنوں میں گھرے ہوئے تھے اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی مصلحت کی خاطر جہاد کی اجازت نہ دی تھی۔ لیکن جب مناسب وقت آگیا' جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا ہوا تھا اور حالات ساز گار ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جہاد فرض کر دیا۔ (اور یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا) تو ان میں سے ایک فریق جزع و فزع کرنے لگا اور یہ فریق ان لوگوں سے ڈرنے لگا جن کے ساتھ انہیں لڑنے کا حکم دیا گیا تھا' حالانکہ وہ لوگ بھی انہی جیسے انسان تھے اور یہ ڈر اس قدر شدید تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ڈر شدید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ڈر تھا' حالانکہ اللہ جیسا شدید عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔

اور نہ اللہ کی پکڑ جیسی اور کسی کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگ نہایت ہی حسرت آمیز الفاظ میں اور سخت جزع و فزع کی حالت میں یہ کہتے ہیں۔ (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (٤: ٧٧)) (اے ہمارے رب' تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا؟) ایک مومن کی جانب سے یہ سوال عجیب و غریب لگ رہا ہے۔ اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فریق کے نقطہ نظر میں اس دین کے فرائض و واجبات کی نوعیت پوری طرح واضح نہ تھی اور یہ فریق اس سوال کے بعد جس خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ نہایت ہی حقیر اور فقیرانہ خواہش ہے۔ (لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤: ٧٧)) (کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی) ہمیں تھوڑا سا وقت اور مل جاتا۔ اور ہم اس خوفناک اور بھاری فریضہ سے دوچار نہ ہوتے۔

بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ بہادری اور تہور اور تیزی سے کسی معاملے کے اندر گھس جانے والے لوگ نہایت تیزی سے جزع و فزع اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ واقعات کے اندر گھس جاتے ہیں اور معاملہ اپنی حقیقی شکل میں سامنے آتا ہے بلکہ یہ صورت حال عموماً قاعدہ کلیہ کی شکل میں پیش آتی رہتی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ یہ جوش اور جرأت اور تہور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص نے مصیبتوں اور مشکلات کا حقیقی اندازہ نہیں لگایا ہوتا۔ یہ جوش و خروش حقیقی بہادری' مشکلات کے انگیز کرنے اور ثابت قدمی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ کبھی یہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مشکلات تنگی اور تکالیف کے واقع ہونے کے احتمالات کم ہوتے ہیں اور ایسے شخص کو شکست اور ہزیمت نظر نہیں آتی۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کے اندر جوش و خروش زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ آگے بڑھتے ہیں' جلدی حرکت میں آتے ہیں اور ہر قیمت پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی اس حرکت' اقدام اور فتح کی راہ میں حائل مشکلات کا اچھی طرح اندازہ نہیں لگایا ہوتا۔ چنانچہ جب ان کا سامنا ان تکالیف سے ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان کے اندازوں سے زیادہ مشکل ہیں۔ وہ ان کے تصور سے زیادہ شدید ہوتی ہیں تو وہ الٹے پاؤں پھرنے والوں اور جزع و فزع کرنے والوں کی پہلی صف میں ہوتے ہیں' لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور جو لوگ مشکلات کو انگیز کر سکتے ہیں' سختی و نرمی برداشت کر سکتے ہیں وہ ان مشکلات کے لئے قبل از وقت تیاری کرتے ہیں۔ حرکت اور اقدام کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ان کے نفوس ان مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں اور کسی معرکے میں تیاری کے بعد کودتے ہیں۔ یہ پرجوش' سرتیز اور آگے بڑھنے والے ایسے لوگوں کو کمزور سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی سنجیدگی اور متوازن شخصیت ان کو

متاثر نہیں کرتی لیکن حقیقی معرکے کے وقت یہ بات نظر آتی ہے کہ ان میں سے کون زیادہ مشکلات کو انگیز کر سکتا ہے اور کون ہے جس کی نظر دور رس ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان آیات میں جس فریق کا ذکر ہے' وہ اس قسم لوگوں پر مشتمل تھا' کہ جن کو مکہ میں مشکلات اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ ان مشکلات پر صبر نہ کر سکتے تھے اور یہ لوگ اپنی توہین بھی برداشت نہ کر سکتے تھے 'اس لئے کہ یہ شریف لوگ تھے 'اس وجہ سے وہاں یہ لوگ جوش میں آکر حضور ؐ سے یہ اجازت طلب کرتے تھے کہ آپ ان کو ان اذیتوں پر مدافعت کرنے کی اجازت دیں تاکہ وہ اپنی عزت و آبرو کے بچانے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ اور حضور ؐ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ان لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ ذرا انتظار کریں' ہر کام اپنے وقت پر ہو گا۔ ہر کام کے لئے تربیت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر اقدام وقت پر کیا جاتا ہے اور وقت آنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگ مدینہ میں امن و امان سے رہنے لگے ' نہ وہاں ان کی تذلیل ہوتی اور نہ ہی وہاں اذیت ہوتی اور یہ حالت ان ذاتی اور شخصی نیش زنیوں کے بعد انہیں نصیب ہوئی تھی جو مکہ میں معمول تھا' اس لئے ایسے لوگ جنگ میں دلچسپی نہ رکھتے تھے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی جواز پاتے تھے 'یا کم از کم یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس بارے میں کسی شتابی کی ضرورت نہیں ہے۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴:۷۷)

(اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟) یہ فریق غالباً مومنین تھے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نہایت ہی عاجزی سے اور غمگین انداز میں اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ان کی اس عاجزی اور غم اندوز لہجے کو ہمیں مدنظر رکھنا چاہئے۔ لیکن ان لوگوں کا ایمان ابھی پختہ معلوم نہیں ہوتا' اور ان کے تصور حیات کے نشانات ابھی تک واضح نہ تھے۔ اس پیراگراف میں جس فریق کا ذکر ہے ان کے ذہن میں اسلامی نظام حیات کے اصل مقاصد ابھی تک واضح نہ تھے۔ یہ مقاصد چند لوگوں کی ذات کو بچانے یا کسی قوم کو بچانے اور یا کسی وطن کو بچانے سے زیادہ بڑے اور اونچے تھے۔ اسلامی نظام حیات کے مقاصد کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض پر اسلامی نظام حیات کو قائم اور غالب کیا جائے اس کا بنیادی مقصد اس پورے کرۂ ارض پر ایک عادلانہ نظام کا قیام اور ایک ایسی سلطنت کا قیام ہے جو پوری قوت سے ان رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہو' جو دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں کھڑی ہیں اور جو لوگوں کو اس بات سے روکتی ہیں کہ دعوت اسلامی کی طرف کان دھریں۔ یہ حکومت اپنے اندر اتنی طاقت بھی رکھتی ہو کہ دنیا میں اگر کوئی اپنی خوشی اور اپنے اختیار سے کوئی عقیدہ اپنا لے تو وہ اسے ہر قسم کے تشدد اور دباؤ سے بچا سکے۔ چاہے یہ تشدد کسی قسم کا بھی ہو۔ مثلاً یہ کہ کسی کو محنت و مزدوری سے نہ محروم کیا جائے اور معاشرے کے اندر اپنی مرضی کی تگ و دو سے محروم نہ کیا جائے۔ غرض یہ وہ اونچے مقاصد ہیں جو کسی کو ذاتی

اور شخصی طور پر اذیت پہنچانے یا نہ پہنچانے کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں نصیب ہونے والا امن و سکون (اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ کسی وقت تھا) اس قدر اہم نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مہم اور تحریک جہاد سے مزید کچھ عرصے کے لئے محروم رکھا جاتا۔

ابھی تک اس فریق کا ایمان اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی ذات کو بیچ میں سے نکال دیں۔ وہ اللہ کے احکام کو سنیں اور انہی احکام کو علت و معلول اور اسباب و اثرات قرار دیں۔ ان کو قول فیصل قرار دیں، چاہے کوئی اور گہری حکمت ان کی سمجھ میں نہ آئے، لیکن ابھی تک اس فریق کا تصور دین اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ یہ لوگ اس دین کی اصل مہم اور مقصد کو سمجھ سکتے۔ مومن بحیثیت مومن اللہ کا دست قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ اس دنیا کے انسانوں کی زندگی میں اس کے ذریعے جو رسم و رواج چاہتا ہے، نافذ کرا دیتا ہے۔ چنانچہ سیاق کلام سے ایسے لوگوں کے موقف کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور ان کے اس موقف پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں اہل اسلام کو، ان پر ہونے والے مظالم کے انتقام کی اجازت کیوں نہ دی؟ انہوں نے اس دست درازی کو کیوں برداشت کیا اور قوت کے استعمال کی وجہ سے انہوں نے ان نیش زنیوں کا علاج کیوں نہ کیا حالانکہ مسلمانوں میں سے اکثر لوگ ایسا کر سکتے تھے۔ کیونکہ تمام لوگ نہ تو کمزور تھے اور نہ بزدل۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے اور نہ مسلمان مکہ میں قلت قلیلہ تھے۔ وہ اس انتقام سے باز رہنے اور صرف اقامت صلوٰۃ، ادائیگی زکوٰۃ اور صبر و برداشت پر اکتفاء کیوں کرتے تھے۔ حالانکہ بعض مسلمانوں پر ایسا تشدد ہو رہا تھا جو ناقابل برداشت تھا۔ بعض ایسے تھے جو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے دین کے بارے میں فتنے میں پڑ جاتے تھے۔ اور بعض ایسے بھی تھے جو ان تکالیف کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

اس کی کیا حکمت تھی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ جو حکمت ہم بیان کریں گے اسے گویا ہم اللہ کی طرف منسوب کریں گے جبکہ اللہ نے خود وہ حکمت بیان نہیں کی۔ اس طرح ہم اللہ کے احکام و فرائض کے وہ اسباب و علل بھی بیان کر سکتے ہیں جو درحقیقت ان احکام کے اسباب نہیں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بیان کردہ اسباب بھی وہی ہوں لیکن ان کے علاوہ اور اسباب اور حکمتیں بھی ہوں، جن کا علم اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں دیا۔ اسی میں ہمارے لئے خیر اور بھلائی تھی کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو۔ یہ ہے ایک مومنانہ موقف جو کوئی اللہ کے احکام اور شریعت کے قوانین کے سامنے اختیار کر سکتا ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے متعین اور مخصوص حکمت اور علت خود حتمی طور پر بیان نہیں کی، چاہے ہمارے ذہن میں اس کی جو علت بھی آئے اور جو حکمت بھی ظاہری طور پر نظر آئے۔ چاہے کسی حکم کی جو کیفیت تنفیذ بھی ہمارے ذہن میں آئے یا اس فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ بھی ہمارے فہم میں آئے جہاں تک عقل اس کا ادراک کر سکتی ہو، لیکن اچھا موقف یہی ہے کہ انسان مختلف احتمالات میں سے اسے ایک احتمال ہی سمجھے اور بالجزم یہ نہ کہے کہ یہی ہے وہ حکمت جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی اور اس کے سوا کوئی اور حکمت نہیں ہے۔ اگرچہ کسی کو اپنے علم و خرد پر پورا پورا اعتماد ہو اور اگرچہ اس نے احکام الٰہی میں نہایت ہی گہرا غور و خوض کیا ہو، اس لئے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہونے والی تمام حکمتوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ محتاط انداز جس کو ہم تجویز کر رہے ہیں بارگاہ ایزدی کے آداب سے زیادہ قریب ہے۔ اور احتیاط کا بھی تقاضا ہے کہ اللہ

کے علم اور انسان کے علم کے درمیان طبیعت اور حقیقت کا امتیاز رہے۔

بارگاہ ایزدی کے ان آداب کا خیال رکھتے ہوئے' میں اس موضوع پر اب بات کرتا ہوں کہ مکہ مکرمہ مین جہاد کیوں فرض نہ ہوا اور مدینہ میں جا کر کیوں فرض ہوا؟ اس موضوع پر میں وہ باتیں بیان کروں گا جو ہمیں نظر آتی ہیں کہ شاید یہی سبب اور حکمت ہو' لیکن یہ سبب و حکمت دونوں بطور احتمال بیان کئے جا رہے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے اسے ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنی جانب سے اللہ کے احکام کے لئے اسباب اور حکمتیں فرض نہیں کرتے۔ اصل حقیقت کا علم صرف اللہ جل شانہ کو ہے اور اس نے نص صریح کے ذریعے اس کی اطلاع ہمیں نہیں دی........ یہ اسباب جو ہم بیان کر رہے ہیں محض اجتہادی ہیں' ان میں صحت کا بھی احتمال ہے' اور غلطی کا بھی۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں ان اسباب کے ذکر سے صرف یہ مقصد ہے کہ ہم اللہ کی آیات میں تدبر کریں اور یہ سمجھیں کہ ہمارے دور میں غور و فکر کے بعد ہم پر یہ اسباب واضح ہوئے۔

(الف) یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ مکی زمانہ تربیت اور تیاری کا زمانہ تھا۔ یہ تیاری ایک متعین خاندان میں' ایک مخصوص قوم میں اور متعین ظروف و احوال میں ہو رہی تھی۔ اس تربیت اور تیاری کے اہداف یہ تھے کہ ایک عرب کی شخصیت کو ایسے حالات میں صبر کرنے پر تیار کیا جائے جن میں وہ کبھی صبر نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کی ذات یا اس کے زیر کفالت لوگوں پر زد پڑے اور وہ اس پر صبر کرے۔ تاکہ وہ عرب شخصیت اپنی قبائلی شناخت اور اپنی ذات کو بھول جائے اور اس کی زندگی کا محور اس کی ذات اور اس کے زیر کفالت لوگ ہی نہ ہوں اور وہ اپنی زندگی صرف اپنی ذات کے لئے متحرک نہ کرے۔ نیز ایک عرب مزاج کو یہ تربیت دینا مقصود تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے تاثر پر ہی وہ جوش میں آ جائے اور پہلی ہیجان انگیز حرکت پر ہی آپے سے باہر نہ ہو جائے اس کی حرکت اور اس کے مزاج کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے۔ اس کو یہ تربیت بھی دینا مقصود تھا کہ وہ ایک منظم سوسائٹی کا فرد ہو اور اس کی ایک قیادت ہو جس کی طرف وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں رجوع کرنے کا عادی ہو جائے اور وہ کوئی کام بھی نہ کرے مگر اس قیادت کے اشارے کے مطابق اگرچہ یہ اوامر اس کی عادی زندگی کے خلاف اور متضاد ہوں۔ ایک عرب شخصیت کی تربیت کے باب میں یہ نہایت ہی بنیادی باتیں تھیں۔ اس سے ایک اسلامی سوسائٹی کی تشکیل مقصود تھی جو ایک قیادت کے تابع ہو' جو ترقی پذیر اور مہذب سوسائٹی ہو اور قبائلی اور غیر مہذب (Barbarian) سوسائٹی نہ ہو۔

(ب) اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قریش کے ماحول میں پر امن دعوت زیادہ موثر ہو سکتی تھی' اس لئے کہ یہ سوسائٹی شرفاء کی سوسائٹی تھی اور اگر اس سوسائٹی کے اندر مسلمان جنگ شروع کر دیتے تو اس کی وجہ سے یہ لوگ بغض و عناد میں اور تیز ہو جاتے۔ ایسے حالات میں جو مکہ میں اس وقت تھے' خونریز لڑائیاں شروع ہو جاتیں اور جنگ داحس' جنگ بسوس اور جنگ غبراء کی طرح قتل و مقاتلے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہ جنگیں عربوں کی مشہور جنگیں تھیں اور سالہا سال تک مسلسل لڑی جاتی رہیں۔ اس جدید جنگ کا تعلق اسلام سے ہوتا اور تمام واقعات اسلام کے حوالے سے یاد کئے جاتے۔ ان جنگوں کا کبھی خاتمہ نہ ہوتا اور اسلام بجائے اس کے کہ ایک دعوت ہوتی' وہ جنگ و جدال کی طویل داستان ہوتا اور ان داستانوں کے نتیجے میں اسلام کی

اصل دعوت پس منظر میں چلی جاتی۔اس دعوت کا یہ حال ابتدائی مرحلے ہی میں ہو جاتا اور کچھ عرصے کے بعد یہ ختم ہی ہو جاتی۔

(ج) یہ اس لئے بھی تھا کہ اگر مکہ میں جہاد کی اجازت دی جاتی تو گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی۔اس لئے کہ مکہ مکرمہ کے اندر کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی جو لوگوں پر کنٹرول کر سکتی۔نیز وہاں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جو مسلمانوں کو تکلیفات دیتی تھی 'بلکہ مسلمانوں کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں وہ ہر مسلمان کے اپنے رشتہ داروں ہی کے ذریعے دی جاتی تھیں۔خود رشتہ دار ہی مسلمان ہونے والے لوگوں پر تشدد کرتے 'انہیں اذیت دیتے اور اپنے خیال کے مطابق ان کی تربیت کرتے۔اگر مکہ میں جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی اور لوگ کہتے دیکھو یہ ہے اسلام' حالانکہ اسلام پر فتنہ ڈالنے کا الزام اس وقت بھی لگایا گیا تھا جب مسلمانوں کو حکم یہ تھا کہ ہاتھ روکے رکھو۔لیکن قریش حج اور عمرہ کے لئے آنے والوں اور تجارتی بازاروں کے اندر اسلام کے خلاف یہی پروپیگنڈا تو کرتے رہتے تھے۔وہ کہتے کہ محمد باپ بیٹے کے درمیان اور ایک شخص اور اس کے قبیلے کے درمیان عداوت ڈال دیتے ہیں۔اگر اسلام لڑکوں اور غلاموں کو یہ اجازت دے دیتا کہ وہ والدین کو اور اپنے آقاؤں اور اپنے سرپرستوں کو قتل کر دیں اور ہر گھر اور محلہ میں یہ جنگ شروع ہو جاتی تو قریش کے پروپیگنڈے کا عالم کیا ہوتا؟

(د) اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد پر بوجہ اسلام مظالم ڈھا رہے تھے' جو لوگ اپنے غلاموں کو اذیت دیتے تھے اور جو لوگ اپنے زیر سرپرستی لوگوں پر تشدد کرتے تھے' اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ آگے جا کر اسلام کے حق میں عظیم خدمات سرانجام دینے والے ہیں' یہ اسلام کے سپاہی ہوں گے' مخلصین اور قائدین بنیں گے۔کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمرؓ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

(ہ) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربوں کی خودداری اور شرافت کا تقاضہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ مظلوم کے حق میں آواز اٹھاتے تھے۔ایسا مظلوم جس پر ناحق تشدد کیا جا رہا ہو لیکن وہ اپنی بات کا اس قدر پکا ہو کہ وہ کسی قیمت پر بھی باز نہ آ رہا ہو۔خصوصاً اس صورت میں جبکہ نہایت ہی شریف لوگوں پر تشدد ہو رہا ہو اور ایسے کئی واقعات ہوئے جن سے اس نظریے کی صحت کا ثبوت ملتا ہے۔ابن الدغنہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ وہ حضرت ابوبکر کا ساتھ چھوڑ دیں اور وہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔انہوں نے کہا کہ یہ بات عربوں کے لئے نہایت ہی شرم کی بات ہے۔انہوں نے حضرت ابوبکر کو پیشکش کی کہ وہ ان کی حمایت کریں گے۔اس کی ایک دوسری مثال شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کا محاصرہ ہے۔یہ محاصرہ اس قدر طویل ہو گیا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور ان پر سخت مصائب ٹوٹ پڑے۔اگر قدیم زمانوں کی اور سوسائٹیوں میں یہ واقعہ ہوا ہوتا تو لوگ مظلوموں کو حقیر سمجھتے اور ان کے ساتھ مذاق کرتے اور ظالموں کو عزت اور وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا (لیکن وہاں کچھ جو ہوا وہ تاریخ عرب کی زریں مثال ہے)۔

(و) اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی' اور وہ مکہ مکرمہ ہی میں زندہ رہ سکتے تھے۔اس لئے کہ جزیرۃ العرب کے دوسرے علاقوں تک دعوت پہنچی ہی نہ تھی۔اگر پہنچی تھی تو اس کے

بارے میں کچی پکی خبریں ہی جابجا پہنچی تھیں۔لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تحریک اسلامی اور قریش کے اندر بعض لوگوں کے درمیان داخلی اختلافات ہیں اور اگر جنگ شروع ہوگئی ہوتی تو وہ غیر جانبدار ہوتے اور دیکھتے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ایسے حالات میں ممکن تھا کہ یہ معرکہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کے مارے جانے کے بعد ختم ہی ہو جاتا۔ اگرچہ یہ قلیل تعداد اپنے مقابلے میں دوگنا کفار کو قتل کر دیتی 'لیکن ان کے ختم ہونے کے بعد شرک اپنی جگہ مزید مضبوط ہو جاتا اور اسلام کی یہ مختصر فوج صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔ اسلامی نظام حیات دنیا میں حقیقی روپ اختیار نہ کر سکتا حالانکہ اسلام ایک ایسا دین تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا میں بطور نظام زندگی قائم ہو اور عملاً لوگوں کی زندگیوں میں نافذ ہو۔

(ز) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکی دور میں اس بات کی حقیقی ضرورت تھی ہی نہیں کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جائے کہ وہ مقابلہ کر کے تشدد کی مدافعت کریں۔اس لئے کہ دعوت اسلامی کا بنیادی کام ہو رہا تھا اور دعوت مسلسل جاری تھی۔حضرت محمد ؐ کی ذات بابرکات موجود تھی اور بنی ہاشم کی تلواریں آپ کی حفاظت کے لئے ہروقت بے نیام تھیں۔اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھاتا تو اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا اور اس وقت کا قبائلی نظام موجود تھا جس میں ہر قبیلہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ خواہ مخواہ بنی ہاشم کے ساتھ لڑائی میں الجھ نہ جائے اور یہ خطرہ ہر اس صورت میں بالکل موجود تھا اگر کسی قبیلے کا کوئی فرد حضور ؐ پر ہاتھ اٹھاتا۔چونکہ داعی کی شخصیت محفوظ تھی اور اس کی حفاظت ہو رہی تھی 'اور داعی بنی ہاشم کی امداد سے اور اس وقت کے موجودہ قبائلی نظام کے رسم و رواج کے مطابق شب و روز دعوت دے رہا تھا۔ داعی نہ دعوت کو خفیہ رکھ رہا تھا اور نہ اپنی بات کسی سے چھپاتا تھا کہ کسی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ کو دعوت پھیلانے سے روک سکے۔ آپ قریش کی مجالس میں 'خانہ کعبہ میں 'جبل صفا پر اور عمومی اجتماعات میں دعوت اسلامی کا کام کر رہے تھے اور کسی شخص کی یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ سکے۔کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ آپ کو اغواء کر سکے 'آپ کو قید کر سکے 'اور آپ کو قتل کر سکے 'اور کوئی آپ کو اس کی مرضی کی بات کہنے پر مجبور نہ کر سکتا تھا کہ آپ اپنے دین کی بعض باتیں کہہ سکتے اور بعض باتوں پر خاموش رہتے۔ایک بار جب انہوں نے آپ کو یہ پیشکش کی کہ وہ ان کے خداؤں اور الہوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ان کی بدگوئی نہ کریں تو آپ نے ان کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔نیز جب انہوں نے یہ پیشکش کی کہ کچھ نرمی وہ کریں اور کچھ نرمی قریش کریں گے تو آپ ؐ نے اس کو بھی رد کر دیا۔یعنی کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اپنانے سے انکار کر دیا۔پیشکش یہ تھی کہ بعض باتیں حضور ؐ ان کی مان لیں اور بعض باتیں وہ اسلام کی مان لیں گے تو حضور نے اس کا بھی انکار کر دیا۔غرض دولت اسلامی کا وجود قائم تھا۔حضور اکرم ؐ موجود تھے اور بنی ہاشم بطور محافظ کام کر رہے تھے اور حضور ؐ ہر شکل و صورت میں اور تمام ذرائع سے اپنی دعوت پھیلانے میں آزاد تھے۔ایسے حالات میں جنگ اور جہاد کی فی الواقعہ کوئی حقیقی ضرورت بھی نہ تھی کہ قبل از وقت جہاد و قتال شروع کر دیا جائے اور سب سے اہم وجہ یہی تھی کہ قریش کا خاندان اس دعوت کے لئے سازگار تھا اور اس کے اچھے نتائج نکلنے والے تھے۔

یہ تمام پہلو' جہاں تک ہم سمجھتے ہیں' اس حکمت کے بعض پہلو ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے مکہ میں جہاد و قتال کا آغاز نہ ہوا اور وہاں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں' نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں۔ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تیاری اور تربیت مکمل ہو جائے گی اور دعوت اسلامی کا مکی منصوبہ بھی اپنے اختتام تک پہنچ جائے گا۔ مسلمان اپنی قیادت کے احکام کا انتظار کریں گے اور جب وقت آئے گا تو اپنے آپ کو اس فریضہ سے عہدہ بر آ کر سکیں گے اس لئے کہ اس فرض کی ادائیگی میں اب ان کی کوئی ذاتی غرض و غایت نہ ہوگی اور ان کا جہاد و قتال اب صرف اللہ کے لئے ہو گا۔ فی سبیل اللہ ہو گا اور فی الوقت دعوت اپنی رفتار سے بہرحال جاری تھی' اس کی حمایت ہو رہی تھی۔ اور اس سے محبت کرنے والے موجود تھے اور نگہبان تھے۔

اس منصوبے کی جو حکمت بھی ہو بہرحال اس وقت ایسے پرجوش لوگ موجود تھے جو بظاہر اس گھڑی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے کہ انہیں جنگ کی اجازت دی جائے۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤:٧٧)

(جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے یا اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے: ہمارے پروردگار' تو نے کیوں ہم پر قتال فرض کر دیا' کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟)

اسلامی صفوں میں ایک ایسے گروہ کی موجودگی جو جہاد و قتال سے کتراتا ہو' ایک قسم کی بے چینی پیدا کرتی تھی اس طرح اسلامی صفوف میں ایک طرف یہ گروہ تھا جو جزع و فزع کرتا تھا۔ دوسری طرف سچے اور کامل مومنین تھے جو پورے طور پر ثابت قدم تھے اور اپنے نصب العین پر مطمئن تھے اور راہ حق میں آنے والی بے چینیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور اس راہ کی مشقتوں کو برداشت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کے اندر ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس فریق مومن کے اندر بھی سچائی کے لئے جوش و خروش پایا جاتا تھا' یہ عزم اور ارادے والے تھے' انہیں یقین و ثبات حاصل تھا' مگر یہ لوگ ہر جذبے کا اظہار اپنی جگہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جب جنگ شروع ہی نہ ہوئی ہو اور اس کے احکامات ہی نہ دیئے گئے ہوں تو وہ محض تصور اور خالی نعرہ بازی ہوگی اور جب حقیقی خطرے کا سامنا ہو تو یہ بخار ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کا علاج قرآن کریم نے اپنے انداز میں کیا:

(قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٧٧) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (٧٨) (٤:٧٧-٧٨))

(کہو دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر

بھی نہ کیا جائے گا' موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال آکر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔) یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں' اور زندگی چاہتے ہیں اور نہایت ہی عاجزانہ حسرت کے انداز میں تمنا کرتے ہیں کہ انہیں کچھ مزید مہلت مل جاتی اور ان کے سرمایہ زندگی میں کچھ مزید اضافہ ہو جاتا۔

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ ایسے جذبات جہاں سے پیدا ہوتے ہیں' وہیں سے ان کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور موت اور زندگی کی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ (قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (۴: ۷۷) (کہہ دو زندگی کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے) زندگی کا تمام سروسامان' بلکہ پوری زندگی کی حقیقت کیا ہے' چند دن' چند ہفتے' چند مہینے یا چند سال؟ اگر قدرے مہلت مل بھی جائے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر پوری زندگی ہی ایک مختصر وقت ہے تو اس مختصر وقت میں وہ کیا سازوسامان جمع کریں گے۔ اس لئے کہ زندگی تو دنوں' ہفتوں اور مہینوں اور سالوں ہی کے اندر محدود ہے۔ اس لئے اس مختصر زندگی کا طول بھی مختصر ہے۔

(وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (۴:۷۷)) (اور آخرت ہی ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے)

ایک تو اس لئے کہ معاملہ دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ دنیا اس انسانی سفر کی آخری منزل نہیں ہے۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے اور اس مرحلے کے بعد آخرت ہے اور سرمایہ وہی ہے جو آخرت کے لئے جمع ہو۔ پھر یہ کہ آخرت کا دور طویل ہے اور لا انتہا ہے' اور اس کا سرمایہ خیر ہے اور بہتر ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہوں وہ اسے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں بات خوف اور ڈر کی ہو رہی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا ذکر کیا جو اگرچہ ڈر ہی ہے لیکن خدا کا ڈر۔ یعنی اگر کوئی ڈرتا ہے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے' انسان سے کیا ڈرنا؟ لیکن ایک گروہ مسلمانوں کے اندر ایسا موجود ہے جو لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ ہاں جو خدا سے ڈرتا ہے تو پھر وہ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ جس کے دل میں خوف خدا بس جائے پھر اس دل میں کسی اور کے خوف کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا کوئی بھی کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا۔

(وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۴:۷۷)) (اور تم پر شمہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا) تمہارے اجر میں کوئی غبن نہ ہو گا' کوئی نقصان نہ ہو گا اور کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اگر دنیا میں ان سے کوئی چیز رہ گئی تو دار آخرت تو آنے ہی والا ہے۔ وہاں وہ کمی پوری کر دی جائے گی جہاں کوئی ظلم نہ ہو گا اور حساب و کتاب میں کوئی کمی نہ ہو گی اور دنیا و آخرت کا فائنل بل مل جائے گا۔

ان حقائق کے باوجود بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفوس کے اندر یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اسی زمین پر کچھ دن اور مہلت مل جائے۔ اس کے باوجود کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت میں جزائے خیر کے بھی امیدوار ہیں' تاہم وہ ایسی خواہش دل میں رکھتے ہیں' خصوصاً وہ لوگ جو ایمان کے ایسے درجے میں ہوں جس میں یہ فریق زیر بحث تھا۔

یہاں اب بات کو ایک آخری جھلکی میں دوبارہ پیش کیا جاتا ہے اور ایک ہی فقرے میں غلط تصور اور غلط سوچ کو

درست کر دیا جاتا ہے ۔ موت و حیات اور تقدیر اور اجل کے بارے میں سوچ کو درست کر دیا جاتا ہے ' نیز جہاد و قتال کے زاویے سے موت و حیات کو ایک نج دیا جاتا ہے ۔ اس فریق کا یہ جزع و فزع اسی لئے تو تھا کہ یہ سمجھتے تھے کہ موت قتال کے نتیجے میں آتی ہے حالانکہ (اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ---------- (٤: ٧٨)) (موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو)۔ موت تو ایک مقرر وقت پر آتی ہے ۔ اس کا تعلق قتال اور امن سے نہیں ہے ۔ اس کا تعلق جائے رہائش کی پختگی اور ناپختگی سے بھی نہیں ہے ۔ نیز اگر کوئی فریضہ جنگ سے پہلوتہی کرے تو بھی موت مؤخر نہیں ہو سکتی اور نہ فرائض جنگ اور جہاد کی وجہ سے موت وقت سے پہلے آتی ہے ۔

موت کا ایک وقت مقرر ہے اور یہ معاملات اس سے بالکل جدا ہیں ۔ ان کے درمیان کوئی تعلق سبب و مسبب نہیں ہے ۔ بلکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت پہنچ جائے تو سبب کوئی بھی فراہم ہو جاتا ہے ۔ وقت کے سوا اور کوئی سبب مرگ نہیں ہے ۔ اس لئے کہ یہ تمنا کرنا کہ قتال کا فرض ہوتا اگر قدرے مؤخر ہو جاتا ایک لغو تمنا ہے ۔ نیز قتال اور غیر قتال کے حالات میں اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرنے کے بھی کچھ معانی نہیں ہیں ۔

قرآن کریم ایک لطیف لچ کے ساتھ دل کی دنیا بدل دیتا ہے ۔ موت و حیات کے بارے میں ایک انسان کی سوچ ہی بدل جاتی ہے ۔ اور انسان کی سوچ اور شعور میں جو خوف و ہراس ہوتا ہے وہ یک لخت دور ہو جاتا ہے ۔

لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ انسان احتیاطی تدابیر اختیار ہی نہ کرے اور اس کے دائرہ اختیار میں بچاؤ اور نگہداشت کے لئے جو تدابیر ہیں ' انہیں کام میں نہ لائے ۔ ابھی ابھی یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ۔ (خُذُوْا حِذْرَکُمْ) تم بہت ہی محتاط رہو ۔ اور صلوٰۃ الخوف کے مسائل کے بیان کے موقعہ پر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ۔ ایک دوسری جگہ (وَاَعِدُّوْا) کا حکم دیا گیا کہ خوب تیاریاں کرو ۔ یہ تمام احکام اپنی جگہ درست ہیں ' البتہ ان تیاریوں کے ساتھ موت و حیات کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ احتیاطی تدابیر اور جنگی سازوسامان کی فراہمی کی اپنی جگہ پر ایک حکمت ہے اور ان احکام کی پیروی ضروری ہے ۔ یہ اللہ کی تدابیر ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے ۔ لیکن موت بہرحال اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے اور یہ بالکل ایک دوسرا عقیدہ اور حکم ہے اور اس پر یقین رکھنا بھی فرض ہے ۔ اگرچہ احتیاطی تدابیر بھی فرض ہیں اور جنگی تیاریوں کی بھی ظاہری اور باطنی حکمتیں ہیں ۔ لہٰذا دونوں احکام کی پیروی ضروری ہے ' پورے توازن اور پورے اعتدال کے ساتھ ۔ تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے .... یہ ہیں اسلام کی ہدایات اور صحیح اسلامی پالیسیاں ۔ افراد اور جماعت کی تربیت کا یہ اسلامی منہاج ہے ۔

---ooo---

غالباً یہاں آکر مہاجرین کے اس گروہ کی بات ختم ہو جاتی ہے اور اب اسلامی صفوں میں پھیلے ہوئے ایک دوسرے عنصر کی بات شروع ہوتی ہے ۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی کا دوسرے عناصر کے ساتھ یہ بھی ایک موجود عنصر ترکیبی تھا ۔ اگرچہ سابقہ بات کے اندر انقطاع اور نئی بات کا آغاز یہاں نظر نہیں آتا ' نہ کوئی فصل ہے ' نہ کوئی وقف ہے ' جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آنے والی بات ایک دوسرے عنصر کے بارے میں ہے ۔ الا یہ کہ پہلے فریق کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن اس

بارے میں اس سے قبل ہم جو نکات بیان کر آئے ہیں وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۷۸) مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰)(۴:۷۸ تا ۸۰))

"اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔ کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمد ﷺ' ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

جن لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں جو بھلائی پیش آتی ہے اس کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور جو برائی انہیں درپیش ہوتی ہے' اس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کرتے ہیں ان کے اس فعل کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبی ﷺ کے بارے میں بدفالی کا خیال کرتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ نبی ﷺ کی وجہ سے ان پر مصائب نازل ہوئے۔ اگر خشک سالی ہو جائے' اگر مویشی نسل کشی نہ کریں یا اگر کسی موقعہ پر ان پر مصیبت آ جائے تو وہ ان چیزوں کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرتے۔ اور اگر انہیں کوئی بھلائی اور کامیابی ہوتی تو کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر نبی ﷺ کی قیادت پر الزام تراشی کرتے تھے۔ اور یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ حضور ﷺ ان پر جو فرائض عائد فرماتے تھے' ان سے گلوخلاصی کرا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قتال فی سبیل اللہ کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوں۔ تو بجائے اس کے کہ وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی ہم تو ضعیف ہیں اور بزدل ہیں اور جنگ سے ڈرتے ہیں' انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضور کی قیادت پر جرح و قدح کرنے لگے۔ اور اگر بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اگر برائی نصیب ہو تو اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کرتے ہیں یا حضور ﷺ

کے احکام کی طرف کرتے ہیں کہ حضور ؐ کے ان احکامات کی وجہ سے یہ مصیبت پڑی اور خیر سے ان کی مراد اس دنیا کی بھلائی ہوتی ہے اور شر سے مراد ان کی اس دنیا کا نقصان ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی مشیت کے مطابق لوگوں کو جو حادثات اور واقعات پیش آتے ہیں اس کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بہت ہی غلط ہے۔ نیز ان کا رسول اللہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان پائے جانے والے تعلق کے بارے میں بھی بہت ہی گھٹیا تصور ہے۔

اگر یہ تیسری وجہ ہو تو یہ ان مہاجرین کی طرف سے ہو سکتی ہے جن کا موت وحیات کے بارے میں ابھی عقیدہ صاف نہ ہوا تھا اور اپنے اس تصور موت وحیات کی وجہ سے یہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے تھے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ اور یہ لوگ کہتے تھے (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴:۷۷)) (اے ہمارے رب تو نے ہم پر قتال کو کیوں فرض کر دیا کیا ہی اچھا ہوتا اگر تو اسے قریب وقت تک مؤخر کر دیتا) لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد کچھ دوسرے لوگ ہیں جن میں ان چہروں کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔

یہ مسئلہ جو اس آیت میں لیا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم اور مشکل مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور وہ مسئلہ تاریخ ادیان اور تاریخ فلسفہ کا نہایت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ یعنی مسئلہ جبر و قدر اور مسئلہ تقدیر۔ یہ مسئلہ یہاں بعض لوگوں کے حالات کے بیان میں ضمناً آگیا ہے۔ ان لوگوں کے غلط تصورات کا رد یہاں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس فریق زیر بحث کی فکری غلطی کو درست کرتے ہوئے اس مسئلے کو نہایت ہی سادگی اور بغیر کسی پیچیدگی کے بیان کر دیا۔ ذرا قرآن کریم کے الفاظ میں سنئے۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴:۷۸))

(اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔) بے شک اللہ ہی فاعل حقیقی اور فاعل اول ہے۔ وہی فاعل ہے جو کچھ اس کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسی سے ہے۔ لوگوں کے لئے جو کچھ ہوتا ہے یا لوگوں سے جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ اللہ سے ہے۔ لوگوں کا اختیار صرف اس قدر ہے کہ وہ توجہ کریں اور سعی کریں لیکن کسی فعل کا تحقق صرف اللہ کے ارادے اور تقدیر سے ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے کہ نیکی کی نسبت یا برائی کو وجود میں لانے کی نسبت اور برائی کو کسی کے اوپر لے آنے کی نسبت حضور ؐ کی طرف کرنا' حالانکہ آپ ایک انسان اور مخلوق ہیں اور ہم جیسے ہیں' یہ ایک غیر حقیقی نسبت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس موضوع پر بات کو سمجھتے ہی نہیں۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے لئے بھلائی سمیٹنے کی سعی کرتا ہے۔ اے اللہ تعالیٰ

نے وسائل خیر کو استعمال کرنے کا جو فہم دیا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کسی کو اگر بھلائی نصیب ہوتی ہے تو وہ ارادۂ الٰہی سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی تقدیر کے علاوہ کوئی اور تقدیر تو ہے نہیں جو اشیاء' حادثات اور اس کائنات کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حوادث کو پیدا کر سکتی ہو۔ اب بھلائی بھی اگر کسی کو نصیب ہوتی ہے تو ان وسائل کی مدد سے نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بھلائی کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس لئے عملاً یہی تصور ہوگا کہ یہ بھلائی اللہ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی اور اسی کی تقدیر کا نتیجہ ہے۔

بعض اوقات انسان ایک برائی کے ارتکاب کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا وہ کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے نتیجے میں برائی وجود میں آتی ہے۔ لیکن عملاً برائی کا وارد ہونا اور وجود میں آنا محض اللہ کی قضا و قدر کے تحت ہوتا ہے' اس لئے کہ اس کائنات میں اشیاء کے پیدا کرنے اور حادثات کو وقوع پذیر کرنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

دونوں صورتوں میں 'خیر و شر میں کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا من جانب اللہ ہوتا ہے اور اس آیت میں اسی حقیقت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ رہی دوسری آیت یعنی (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (٤: ٧٩)) (تمہیں جو بھلائی نصیب ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی نصیب ہوتی ہے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہوتی ہے) تو اس میں ایک دوسری حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا پہلی آیت میں بیان کردہ حقیقت سے نہ تعلق ہے اور نہ وہ اس سابقہ حقیقت قضا و قدر میں داخل ہے۔ لہٰذا اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ایک منہاج کار وضع کیا ہے اور اس نے ہر کام کے لئے ایک طریقہ کار وضع کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر کے بارے میں اچھی طرح متنبہ کیا ہے۔ جب انسان اس منہاج پر کاربند ہوتا ہے اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلتا ہے' بھلائی کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور شر سے لرزاں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ راہ ہدایت پر چلنے کے لئے اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں تو ہم ان کی راہنمائی اپنی راہوں کی طرف کر دیتے ہیں) تب انسان بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ بظاہر ایک شخص کسب اور محنت کرتے ہوئے نظر آتا ہے لیکن اس انسانی کسب و عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ کسب و عمل کا منہاج تو خود اللہ نے متعین کیا ہے اس لئے انسان کی سعی میں ہی بھلائی ہوتی ہے' وہ اللہ کے ترازو میں ہوتی ہے اور اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اس لئے کہ بھلائی کا طریق کار وضع کرنے والا اور منہاج عمل متعین کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔ اسی نے تو بھلائی کی طرف راہنمائی فرمائی اور وہی تو ہے جس نے بھلائی کی توفیق دی اور برائی سے ڈرایا۔ کوئی انسان جب اس منہاج پر نہیں چلتا جو اللہ نے متعین کیا ہے اور اس راہ کو نہیں اپناتا جسے اللہ نے مشروع قرار دیا' وہ بھلائی کے لئے سعی نہیں کرتا اور جس برائی سے اسے ڈرایا گیا ہے اس سے نہیں ڈرتا' تو یقیناً اسے برائی سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ ایک حقیقی برائی ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ برائی خود اس کے نفس کی کمائی ہوگی اس لئے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ کے پسندیدہ منہاج عمل سے نکل گیا۔ (یہ ہے اس کا کسب)۔ یہ مفہوم پہلے مفہوم سے مختلف ہے اور دونوں کا دائرہ بھی الگ الگ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نکتہ اب واضح ہو گیا ہے۔

اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نظریہ تقدیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اچھائی اور برائی دونوں کا تعلق اللہ کی مرضی اور تقدیر سے ہے۔ اللہ ہی تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر حادث کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ہر ہونے والے واقعے کا موجد وہی ہے' چاہے اس بارے میں انسان کا ارادہ اور عمل جو ہو' سو ہو اور ہونے والے جیسے حالات میں بھی ہو۔

وہ اصل مسئلہ کیا ہے جو ان نصوص میں بیان کیا گیا ہے یا اس کا ایک پہلو لیا گیا ہے۔ وہ مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ یہ کہ انسان سے جن افعال کا صدور ہوتا ہے' اس میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے یا اس کے لئے جو فائدے یہاں واقع ہوتے ہیں ان میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے اور یہ کہ اس کے افعال ارادی پر جزا و سزا کس طرح مرتب ہوگی جبکہ ہم کہتے ہیں کہ تمام افعال کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ خود انسان کے ارادے' انسان کی توجہ' انسان کے عمل اور تمام دوسرے محدثات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ اور اس قسم کے تمام سوالات جن کا تعلق مسئلہ جبر و قدر کے ساتھ ہے۔ قرآنی آیات اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ ہر حادث اللہ کے ارادے سے حادث بنتا ہے۔ قرآن کریم سب کا سب اللہ کا کلام ہے اور قرآن کریم کی آیات ایک دوسرے کے ساتھ متعارض نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان دونوں امور کے درمیان ایک نقطہ اتصال ضروری ہے۔ انسان کے ارادے اور عمل کا ایک دائرہ ایسا ہے جس کے اندر وہ ذمہ دار ہے اور مسئول ہے' اور اسے سزا و جزاء کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس دائرہ اختیار کا تعارض بھی تقدیر الٰہی اور ارادۂ ربانی کے دائرے کے ساتھ نہ ہو تو یہ دائرے کس طرح متعین ہوں گے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا بیان اور توضیح ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی قدرت کس طرح کام کرتی ہے اس کی کیفیات کا ادراک انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضور ؐ کے دائرۂ کار اور حدود ذمہ داری کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ کہ آپ لوگوں کے حوالے سے کیا موقف اختیار کریں گے اور لوگوں کا تعلق آپ کے ساتھ کس طرح ہو گا۔ اور تمام معاملہ انجام کار اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

(مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰) (۴:۷۹ - ۸۰))

(اے محمدؐ، ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے) رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رسالت کی ذمہ داری ادا کرے۔ اس کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ خیر پیدا کرے یا کوئی شر پیدا کرے۔ یہ تخلیق کا کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اللہ اس پر گواہ ہے کہ اس نے حضرت محمدؐ کو محض ادائے فریضہ رسالت کے لئے بھیجا ہے۔ (وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا) (اور خدا کی گواہی کافی ہے)۔

اور لوگوں کا معاملہ حضرت محمد ؐ کے ساتھ یہ ہے کہ جس شخص نے آپ کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ لہٰذا اطاعت کے معاملے میں اللہ اور رسول کے درمیان کوئی جدائی نہیں ہے۔ نہ اللہ کے قول اور رسول اللہ کے قول کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے۔ پس جو شخص منہ پھیرتا ہے اور رسول اللہ کی تکذیب کرتا ہے تو اس کا حساب و کتاب اور اس کی سزا و جزا کا کام اللہ کے سپرد ہے۔ اللہ نے رسول اللہ کو اس لئے نہیں بھیجا کہ آپ لوگوں کو ہدایت پر مجبور کر دیں یا انہیں دین کے اندر داخل ہونے پر مجبور کر دیں۔ نہ رسولوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں کی اس طرح حفاظت کریں کہ وہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں۔ نہ یہ بات رسولوں کی قدرت میں دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے پاسبان بن جائیں۔

اس بیان کے ذریعے ان کے تصورات اور خیالات کو اس بارے میں درست کیا جاتا ہے کہ جو واقعات انہیں پیش آتے ہیں ان کا تعلق اور وجود اللہ کے ارادے سے ہے اور اللہ کی تقدیر کے عین مطابق ہے اور انہیں جو بھلائی اور برائی پیش آتی ہے' چاہے بھلائی اور برائی کو کسی معنی میں بھی لیا جائے' چاہے ظاہری بھلائی ہو یا حقیقی بھلائی ہو' یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے' نہ اسے وجود میں لا سکتا ہے' نہ اسے باقی رکھ سکتا ہے اور نہ کسی چیز کو صنعت میں لا سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقیقی بھلائی ہے وہ اللہ ہی سے ہے اور جو حقیقی برائی انہیں نصیب ہوتی ہے اس میں ان کے نفوس کا دخل ہوتا ہے۔ یہ برائی انہیں اس لئے نصیب ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

رسول کی پہلی اور آخری ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ رسول ہے۔ وہ نہ منشی ہے' نہ خالق ہے اور نہ کسی حادثہ کو لا سکتا ہے۔ یہ اللہ کی خصوصیات ہیں اور ان میں رسول' اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ وہ بس اللہ کے احکام پہنچانے والا ہے' تب اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت کے لئے ماسوائے رسول اللہ کی اطاعت کے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ رسول اس بات کا مکلف نہیں ہے کہ وہ ان لوگون کے لئے ہدایت کا سامان کرے جو اعراض کرنے والے ہیں اور نہ رسول انہیں اعراض اور نافرمانی سے روک سکتا ہے۔ وہ ابلاغ اور بیان کے بعد اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ہیں فیصلہ کن اور تسلی بخش حقائق۔ واضح اور صریح حقائق۔ ان سے تصورات کی تعمیر اور شعور کی پختگی ہوتی ہے۔ اور یہ حقائق جماعت مسلمہ کو عظیم منصب اور ڈیوٹی کے لئے تیار کرنے کی جدوجہد کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے بعد سیاق کلام ایک دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ گروہ اسلامی صفوف کے اندر گھسا ہوا ہے اور شاید یہ منافقین کا کوئی گروہ ہے۔ قرآن کریم ان کے کردار کو علیحدہ اور نئے عنوان کے ساتھ ذکر کرتا ہے لیکن انداز بیان کے اندر اس کردار سے نفرت بھی جھلکتی ہے۔ اس نفرت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کی تعلیم' راہنمائی بھی کی گئی ہے۔

(وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۸۱) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۸۲) (۴: ۸۱ - ۸۲))

(وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے ۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے ۔ تم ان کی پرواہ نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے ۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس مین بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی) ۔

یہ گروہ ایسا تھا کہ جب یہ رسول اللہ ؐ کے پاس موجود ہوتا اور آپ سے قرآن سنتا اور قرآنی فرائض کو سمجھتا تو کہتا کہ ہم مطیع فرمان ہیں' وہ اس طرح جامع اور مانع اطاعت کا اعلان کرتے' بے قید اطاعت کا اقرار کرتے ۔ اس میں نہ وہ کوئی اعتراض کرتے' نہ کسی قسم کی توضیحات طلب کرتے' نہ کوئی استثناء رکھتے' لیکن جونہی وہ حضور کی مجلس سے اٹھتے' ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر آپ کی باتوں کے خلاف مشورے کرنے لگ جاتا ۔ اور یہ فیصلہ کرتا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل نہ کیا جائے اور کوئی ایسا منصوبہ اپنایا جائے کہ اس پر عمل نہ ہو اور گلو خلاصی ہو جائے ۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت من حیث الجماعت تو یہ کہتی ہے کہ ہم اطاعت کریں گے لیکن ان میں سے ایک گروہ رات کے وقت نکل کر وہ سازش کرتا ہے جو جماعت مسلمہ کے قول کے خلاف ہوتی ہے ۔ اور اس گروہ منافقین کا مقصد اس جماعت کے اندر افراتفری اور بے چینی پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ گروہ منافقین سازش کر رہا ہوتا ہے ۔ ان کی سرگرمیاں اسلامی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ جماعت مسلمہ ان سازشوں کے خلاف ہر میدان میں معرکہ آرا ہوتی ہے اور اپنی پوری قوت ان کے مقابلے میں صرف کرتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور حضور نبی کریم ؐ کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ کی نظروں سے یہ سازشی ٹولہ اوجھل نہیں ہے اور اس کی مکاری سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے ۔ یہ شعور اور احساس کہ ان سازشیوں کی سازشوں سے اللہ اچھی طرح خبردار ہے اہل ایمان کے دلوں کے اندر اطمینان اور قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے ۔ ان کے اندر یہ سکون پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر ہوتے ہوئے یہ سازشیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں ۔ دوسری جانب سے ان سازشیوں کو بھی یہ سخت تنبیہ ہے کہ وہ ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

(وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ) (اور اللہ ان کی یہ تمام سرگوشیاں لکھ رہا ہے) ۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ؐ کو منافقین کے ساتھ معاملہ کرنے کا جو منصوبہ دیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ان کے ساتھ ان کی ظاہری حالت کے مطابق معاملہ کریں گے اور ان کے ساتھ ان کی نیتوں کے مطابق سلوک نہ ہو گا ۔ ان کی خفیہ سازشوں سے اغماض برتا جائے گا اور اعراض کیا جائے گا ۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کے مطابق آخر کار وہ منتشر ہو گئے' کمزور ہو گئے اور ان میں سے جو باقی رہ گئے تھے وہ تتر بتر ہو گئے اور چھپ گئے ۔ اس منصوبے کا ایک حصہ یہ تھا ۔ (فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ) (آپ ان کی پرواہ نہ کریں) ان سے چشم پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کو مطمئن کیا جاتا ہے کہ اللہ کی حفاظت اور پاسبانی پر مکمل بھروسہ رکھو ۔ (وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا) (اور اللہ پر بھروسہ رکھو' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے) بالکل درست' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے' جس کا وکیل اللہ ہو اسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا ۔ نہ اسے کوئی سازش گزند پہنچا سکتی ہے' نہ خفیہ سازش ان کے خلاف چل سکتی ہے' اور نہ ظاہری سازش ۔

سوال یہ ہے کہ پھر گروہ حضور ؐ کے سامنے اقرار اطاعت کرتا اور واپس ہو کر رات کو سازش کرنے میں لگ جاتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تو دراصل یہ گروہ یہ رویہ اس لئے اختیار کرتا تھا کہ اسے اس بات میں شبہ تھا کہ آیا حضور اکرم ؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے ہے یا نہیں۔ جب ایک لمحہ کے لئے اس قسم کا شک پیدا ہو جائے تو بات کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن اور کلام رسول کے اندر قوت اور شوکت اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ کی طرف سے آ رہا ہے اگرچہ عبداللہ کے حلقوم سے سنا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ آپ ہوائی باتیں نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو توکل علی اللہ کرنے کے بارے میں دو ٹوک حکم دیا گیا اور مکرر تاکید مزید کی گئی۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ایک نکتہ پیش فرماتے ہیں۔ اور یہ نکتہ عزت و شرف کی وہ انتہا ہے جس تک قرآن کریم انسان کو پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ عقل سے کام لے اور یہ سمجھ لے کہ وہ ایک ذی شرف مخلوق ہے۔ وہ صاحب عقل و ادراک ہے' اور یہ عقل و ادراک اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے بارے میں فیصلہ ان کے شعور اور ان کی عقل و ادراک پر چھوڑتا ہے۔ اللہ ان کے لئے بصارت و بصیرت کا ایک منہاج متعین فرماتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس منہاج کے مطابق معاملات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ یہ منہاج فہم و ادراک قرآن میں نہایت ہی واضح طور پر متعین کیا گیا ہے۔ اور خود انسانی فہم و ادراک بھی اس منہاج تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس طرح انسان اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی جانب سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

(اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

(۴ : ۸۲) (کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے' اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت کچھ خلاف بیانی پاتے) اس بیان اور ہدایت کے اندر انسانیت کے لئے انتہائی عز و شرف کا مقام پوشیدہ ہے۔ اس میں انسان کے ادراک پر مکمل بھروسہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی شخصیت کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس میں عدالت عقل میں فیصلہ لے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسے مظہر میں جس کا سمجھنا انسانی عقل کے لئے زیادہ دشوار نہیں ہے۔

قرآن کے اندر پائی جانے والی مکمل' جامع اور بے قید ہم آہنگی ایک ایسا مظہر ہے جو اس شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا جو اس کتاب پر تدبر کرے۔ اس مظہر کی سطح اور اس کا دائرہ مختلف لوگوں کی فہم کے مطابق وسیع اور تنگ ہو سکتا ہے۔ مختلف نسلوں اور مختلف قسم کے ذہین لوگوں کے نتائج فکر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہر عقل اور ہر نسل اور ہر دور کے لوگوں کو اپنی بساط کے مطابق اس سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور یہ کمی بیشی لوگوں کے فہم' ان کی عقل اور ان کے علم و ثقافت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کا نتیجہ فکر ان کے تجربے' صلاحیت اور تقویٰ کے مطابق محدود یا لامحدود ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے' ہر نسل اس کی مخاطب ہے' اور درست منہاج فکر و تدبر کے مطابق وہ اس مظہر کا ادراک کر سکتا ہے۔ یعنی یہ وصف کہ قرآن کے اندر خلاف بیانی نہیں ہے اور اس کے اندر مکمل ہم آہنگی اور تناسق پایا جاتا ہے۔ البتہ جس طرح ہم نے کہا' یہ فہم انسان کی صلاحیت' اس کے علمی مقام' تجربے اور تقویٰ

کے حدود کے اندر رہتا ہے۔ یہ گروہ' جسے اس وقت کی موجود نسل کی صورت میں مخاطب کیا گیا تھا' ایک ایسے کلام سے مخاطب کیا جا رہا تھا' جسے وہ خوب سمجھتا تھا۔ اور اپنے فہم و ادراک کے ذریعے وہ اسے عمل میں لاتا تھا' جس قدر اس کی طاقت کے حدود میں ہوتا تھا۔

یہ مظہر اور یہ صفت یعنی مکمل اتحاد فکر اور ہم آہنگی کی صفت کا اظہار سب سے پہلے قرآن کریم کے انداز تعبیر میں ہوتا ہے۔ قرآن کی طرز ادا اور فنی طریقہ اظہار مدعا کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انسانی کلام ہمارے سامنے ہیں' بڑے سے بڑے ادب پاروں میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں' ہم آہنگی بھی ہوتی ہے اور لغزش کلام بھی ہوتی ہے۔ ایک حصہ اگر پر زور ہوتا ہے تو دوسرے میں جھول ہوتی ہے۔ ایک میں اگر فکری تخلیق ہے تو دوسرا حصہ پیش پا افتادہ ہوتا ہے' ایک حصہ اگر رواں ہوتا ہے تو دوسرا نہایت ہی گنجلک ہوتا ہے۔ ایک اگر نہایت ہی روشن ہے تو دوسرا حصہ تاریک ہے' غرض کلام کی فصاحت و بلاغت اور نقص کے سلسلے میں جو اوصاف ہوتے ہیں ان کے اعتبار سے انسانی کلام میں نشیب و فراز ہوتا ہے۔ نقائص کلام میں سے اہم نقص کلام کے اندر روانی اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے جس میں بات جلدی جلدی ایک معیار سے گرتی ہے یا گرے ہوئے معیار سے اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہر انسانی کلام کے اندر یہ مظہر قدم قدم پر سامنے آتا ہے' کسی ایک ادیب کے اگر ادبی کردار کو لیں' یا اس کے انکار کو لیں' یا کسی ایک ہی ادیب کے فن پاروں کو لیں یا کسی ایک سیاست دان کی پالیسیوں کو لیں' یا کسی ایک جرنیل کی جنگی چالوں' یا کسی ایک شخص کی صنعت کاری کو لیں' اس میں معیار کا یہ تفاوت قدم قدم پر نظر آئے گا۔ معیار تعبیر کے اندر زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

قرآن کریم کے اندر یہ صفت نہایت ہی واضح ہے اور پوری طرح منعکس ہے' یعنی کلام میں پختگی اور ہم آہنگی۔ پورے قرآن کے اندر یہ صفت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ہم یہاں جو بات کر رہے ہیں وہ صرف لفظی اور تعبیر کی ہم آہنگی کے زاویے سے ہے۔ اس پوری کتاب کے اندر کلام اور اسلوب اظہار کا ایک ہی معیار ہے' اسی وجہ سے یہ کتاب معجزانہ شان لئے ہوئے ہے۔ یہ کتاب جن موضوعات پر کلام کرتی ہے' مضمون کے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ضرور ہوتے ہیں لیکن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کا معیار ایک ہی رہتا ہے۔ اسلوب ادا میں اس کا کمال قائم رہتا ہے' اور کسی جگہ کلام اپنی معیاری سطح سے گرنے نہیں پاتا۔ کسی جگہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوتی جس طرح انسانی کلام کی حالت ہوتی ہے کہ کبھی معیار کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ۔ یہ کتاب اللہ کی شان کاریگری لئے ہوئے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کے کہنے والا متغیر نہیں ہے اور وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف متغیر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس پر ایک حالت کے بعد دوسرا حال طاری ہوتا ہے۔ (دیکھئے 'التصویر الفنی فی القرآن)

اس کے فنی اسلوب کے بعد پھر یہ عدم اختلاف کی صفت اور مکمل ہم آہنگی اور عام وحدت فکر اس نظام کے اندر بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار و بیان قرآن کریم کی ان عبارات کے اندر کیا گیا ہے اور جس کا مفہوم ان ہم آہنگ عبارتوں کی اندر بیان ہوا ہے۔ یعنی وہ نظام فکر جس کے اوپر نفس انسانی کی تربیت کی گئی ہے یا انسانی معاشرے کی تربیت کی گئی ہے۔ نیز اس نظام زندگی کے تمام اجزاء اور اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک فرد کی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور پھر ایک معاشرے کے اندر فرد کی تمام سرگرمیوں اور نسلاً بعد نسل ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے اندر جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل توافق اور توازن پایا جاتا ہے۔ پھر

انسان کی قوت مدرکہ کے لئے ایک منہاج اور تقویم ہے ' جس کے کئی پہلو ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کی کئی قوتیں اور عمل ادراک میں کام آنے والی مختلف قوتیں ۔ پھر خود حضرت انسان کی ذات اور اس کے تمام معاشروں ' تمام نسلوں اور تمام سطحوں کے اندر بھی ایک مکمل ہم آہنگی رکھی گئی ہے ۔ انسان اور اس کائنات کے اندر بھی مکمل آہنگی ہے جس کے اندر یہ انسان زندگی بسر کرتا ہے ۔ پھر انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے اندر بھی مکمل توافق اور ہم آہنگی ہے ۔ پھر اس کتاب نے اس انسان اور اس پوری کائنات کے اندر اس کی زندگی بسر کرنے میں بھی پوری ہم آہنگی رکھی ہے ۔

جب ایک انسان اور اللہ کی کاریگری کے اندر باعتبار اسلوب کلام اور لفظی تعبیر فرق ہے تو فکری ، نظریاتی اور قانون سازی کے میدانوں میں بھی ' ظاہر ہے کہ انسانی کام اور ربانی کام کے اندر نہایت ہی واضح فرق و امتیاز ہو گا ۔ تمام انسانی نظریات ' تمام انسانی مذاہب و مکاتب کے اوپر انسانی چھاپ بالکل واضح نظر آتی ہے ۔ اور نقطہ نظر کے اندر جزئی اور انفرادی پن واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ ان تمام پہلوؤں کے اندر وقتی حالات اور مشکلات سے انسان متاثر نظر آتا ہے ۔ اور انسان اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ اس کے نظریے ' اس کے مذہب و مکتب کے اندر اور اس کے منصوبوں کے اندر کوئی نہ کوئی تناقض موجود ہوتا ہے جو اس نظام فکر و عمل کے اندر کشمکش شروع کر دیتا ہے اور یہ کشمکش یا تو بہت جلد شروع ہو جاتی ہے یا کچھ عرصے کے بعد شروع ہوتی ہے ۔ پھر یہ انسانی مکاتب فکر و عمل انسان کی بعض خصوصیات کو بالکل دبا دیتے ہیں جبکہ خود انسان کو ان کا نہ علم ہوتا ہے اور نہ انسان انہیں پیش نظر رکھ سکتا ہے ۔ یا پھر بعض شخصیات کے اندر ایسے اوصاف ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ ہی نہیں سکتا ۔ خود انسانی ادراک کے اندر ہزاروں کمزوریاں اپنی جگہ ہوتی ہیں اور جس کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود ہوتا ہے ۔ چونکہ انسانی ادراک کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے منصوبے سے آگے نہیں دیکھ سکتا بلکہ وہ خود اپنے موجود منصوبے کے (مَالَهُ وَمَا عَلَيْهِ) سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتا ۔ اس کے برعکس قرآنی منصوبہ چونکہ علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لئے قرآنی مندرجات و مفہومات ان تمام نقائص سے پاک ہوتے ہیں ۔ یہ مفہومات اور منصوبے مستقل ہوتے ہیں اور پوری کائنات کے اندر مروج نوامیس فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ یہ نوامیس فطرت مستقل اور ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل حرکت میں بھی ہوتے ہیں ۔ اسی طرح قرآنی نظریات بیک وقت متحرک بھی ہوتے ہیں ' اور ثابت بھی ہوتے ہیں ۔

ان آفاق و حدود کے اندر قرآن کریم کی اس صفت پر غور و فکر سے بعض اوقات انسانی ادراک اس کے پورے آفاق کو نہیں پا سکتا اور نہ ہی بعض اوقات ایک پوری نسل اس کا مکمل ادراک کر سکتی ہے بلکہ تمام نسلوں کے ادراک میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا ۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے ہر نسل اپنا حصہ پاتی ہے اور آنے والی ترقی یافتہ نسلوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ آفاق رہتے ہیں ۔ بہرحال اس صفت کے ادراک میں مختلف درجات کے اعلیٰ انسانوں سے کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس طرح دوسری چیزوں کے اندر کسی نہ کسی حد تک اختلاف موجود ہوتا ہے ۔ اور اس باقی آفاق سے اگلی نسلیں بھی اپنا حصہ حاصل کرتی رہتی ہیں اس لئے کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں فرق ہے ۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ تفاوت اور فرق ۔ اس میں مکمل اتحاد اور تناسق ہوتا ہے ۔ ہاں لوگوں کی فہم و ادراک کے حدود میں ضرور فرق ہوتا ہے اور بعض لوگ اس تناسق کو بہت ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور بعض ذرا کم سمجھتے ہیں ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے التصور الاسلامی خصائصہ و مقوماتہ ۔ نحو مجتمع اسلامی ' الاسلام و

مشکلات الحضارہ اور ھذا الدین وغیرہ)۔

لیکن جس قدر ایک عام انسان سمجھ سکتا ہے یا ایک گروہ سمجھ سکتا ہے یا ایک متعین نسل سمجھ سکتی ہے' اللہ تعالیٰ لوگوں کے فہم و ادراک کے سامنے 'جس قدر ان کو حاصل ہے' قرآن کریم کو پیش کرتے ہیں اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اگر غیر اللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلافات پاتے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک مختصر سا توقف کریں اور یہ متعین کر لیں کہ اس مخصوص معاملے میں یا پورے دین کے معاملے میں انسانی ادراک کی حدود کار کیا ہیں؟ کوئی انسان اس بات سے غرے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ خود انسانی ادراک کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کیا ہے اس لئے گویا انسانی ادراک کوئی بہت ہی بڑی شئی ہے۔ انسانی غور و فکر اور ادراک کو بھی اپنی محفوظ حدود کے اندر رہنا چاہئے کہیں وہ اپنے محدود محفوظ دائرے سے باہر بھول بھلیاں میں پھنس نہ جائے۔

قرآن کریم کی ان ہدایات کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی ان کی حدود کو اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ ازمنہ قدیمہ اور دور جدید دونوں میں ایسے اسلامی اہل فکر رہے ہیں جنہوں نے عقل و قیاس کو شریعت کے مساوی درجہ دیا ہے بلکہ یہ لوگ عقل و ادراک کو شریعت کا پاسبان بناتے ہیں..... لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فہم و ادراک کا یہ آلہ بہرحال انسانی قوت مدرکہ ہے اگرچہ اپنی جگہ یہ نہایت ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کے مسئلے کو بارگاہ عقل و تدبر میں پیش کیا ہے لیکن عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ یہ قرآن اور اس کے اندر وضع کردہ پورے کا پورا دین من جانب اللہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے اندر ایسے اوصاف و مظاہر ہیں جنہیں عقل بشری بڑی سہولت سے سمجھ سکتی ہے۔ اور وہ مظاہر اور علامات اس بات کے ادراک کے لئے کافی ہیں کہ یہ دین من جانب اللہ ہے۔ جب یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے تو اس ادراک کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس دین کے اندر جو احکام ہیں انہیں انسان تسلیم کرے چاہے ان کی حکمت انسان کی سمجھ میں آرہی ہو یا نہ آرہی ہو' اس لئے کہ جب ہم نے یہ بات تسلیم کر لی کہ یہ دین اور قرآن من جانب اللہ ہے تو یہ بات از خود تسلیم ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر حکمت موجود ہے پھر یہ بات اہم نہیں رہتی کہ حالات حاضرہ کے اندر لوگوں کی مصلحت اس دین سے پوری ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ جب دین اللہ کی طرف سے ہے تو گویا مصلحت اس کے اندر موجود اور متحقق ہے۔ انسانی عقل شریعت کے مساوی نہیں ہوتی چہ جائیکہ وہ شریعت پر حاکم اور مقتدر ہو جائے۔ اس لئے کہ خود شریعت کی حکمتوں کا ادراک ہر عقل نہایت ہی محدود پیمانے پر کر پاتی ہے اور یہ بات محال ہے کہ عقل شریعت کے تمام زاویوں اور تمام مصلحتوں کا احاطہ کر سکے۔ نہ ایک لحظہ میں نہ پوری انسانی تاریخ میں۔ جبکہ اللہ کی شریعت کی نظر ایک ایک لمحے کی مصلحتوں پر بھی ہوتی ہے اور زمان و مکان کے مصالح پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ شریعت کا کوئی ثابت شدہ حکم صرف انسانی عقل و قیاس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں عقل انسانی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کے ادراک اور ان نصوص کی دلالت اور مفہومات کے اخذ پر غور کرے۔ یہ اجازت عقل کو نہیں دی جا سکتی کہ وہ احکام کی مصلحتوں پر بھی کلام کرے۔ اس لئے کہ جب اللہ کی جانب سے کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو اس میں لازماً کوئی مصلحت ہوتی ہے تب ہی تو وہ آتی ہے۔ عقل کا کام تو ان مسائل میں ہوتا ہے جن میں کوئی نص نہ

ہو' جدید مسائل ہوں۔ایسے مسائل کے بارے جو طریقہ کار اختیار کیا جائے گا اس کے بارے میں ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ ایسے مسائل کو اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔اور یہی وہ دائرہ کار ہے جو حقیقی اجتہاد کے لئے کھلا چھوڑا گیا ہے جبکہ نصوص قرآنی کا فہم وادراک بہرحال ہروقت عقل ہی کے ذریعے ہو گا۔جب کسی نص کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو بس اب وہاں توقف ہی بہتر ہوتا ہے اور عقل کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ فیصلہ دے کہ آیا اس مفہوم میں مصلحت ہے یا نہیں ہے۔عقل انسانی کا اصل دائرہ کار کائنات کے قوانین قدرت ہیں اور یہ نہایت ہی وسیع دائرہ کار ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم عقل انسانی کو اسی قدر مقام و منزلت دیں جو اسے اللہ نے دیا ہے اور جو اس کے لئے مناسب ہے اور اس دائرے کے اندر اسے رکھا جائے جو اللہ نے عقل کے لئے رکھا ہے۔اس دائرے کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ وہ بھول بھلیاں میں جاکر پھنس نہ جائے اور اسے کوئی رہبر کامل نہ ملے۔اور اگر کوئی رہبر ملے بھی تو وہ ایسے راستوں پر پڑ جائے جن کا اسے خود علم نہ ہو۔یہ صورت حال ایک ایسے انسان کے لئے زیادہ خطرناک ہے جو صراط مستقیم کا متلاشی ہو۔

---ooo---

اب سیاق کلام ذرا آگے بڑھتا ہے اور ایک دوسرے گروہ کو لیا جاتا ہے جو اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۳)

(یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن لیتے ہیں' اسے لے کر پھیلاتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔)

یہاں جس گروہ کے بارے میں کہا گیا ہے یہ بھی اسلامی کیمپ میں موجود ایک گروہ ہے لیکن یہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک اسلامی نظام کے راہ و رسم سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔اور اس گروہ کو ابھی تک اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اسلامی کیمپ میں بے چینی پھیلنے کے نتائج کس قدر خطرناک اور کس قدر تباہ کن ہو سکتے ہیں۔اس لئے کہ افواہیں افواہیں ہوتی ہیں' واقعات نہیں ہوتے۔حالات بعض اوقات ایسے سنجیدہ ہوتے ہیں کہ ایک سرسری بات کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے

ہیں - کسی ایک شخص کے بارے میں' کسی گروہ یا جماعت کے بارے میں بعض ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں کہ سرسری ریمارک پاس کرنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ واقعات و نتائج بر آمد ہو جائیں تو پھر ان کا تدارک اور تلافی کسی صورت میں بھی نہیں کی جاسکتی اور یہ لوگ یہ باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ اسلامی کیمپ کے افراد کے اندر پیدا ہونے والی اخوت اور بھائی چارے کا تصور ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔ یہ لوگ اس بات کو اہمیت نہ دیتے تھے کہ آخر کار ایسی غیر ذمہ دارانہ گفتگوؤں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں اور ایسی باتوں کی اشاعت سے نقصان کیا ہوتا ہے کہ جب یہ باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ میں چلتی رہتی ہیں' چاہے یہ باتیں امن کے حالات سے متعلق ہوں یا بے چینی اور خوف کے حالات سے متعلق ہوں۔ دونوں حالات کے اندر بعض خبروں کا پھیل جانا نہایت ہی مہلک اور فساد انگیز ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چوکنے' تیار اور محتاط کیمپ کے اندر دشمن کی سرگرمیوں کو کم کر کے دکھانا غفلت کا باعث ہو سکتا ہے اور اس میں دشمن متحرک ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں امن کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کر دینا لوگوں کو غافل اور سست بنا سکتا ہے اگرچہ متعلقہ ذمہ داران کی طرف سے بار بار احتیاط کی تنبیہ کی جاتی رہے۔ اس لئے کہ اگر خطرہ سروں پر ہو تو ایک انسان کا دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہو جانا' ایسی صورت حال سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ محض ذمہ داران کے احکام کی اساس پر احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس قسم کی سستی اور لاپرواہی بعض اوقات معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک کیمپ اپنی قوت پر مطمئن ہو اور اپنے اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم ہو اس کے اندر خوف پھیلایا جائے' تو ایسے کیمپ میں خوفناک خبروں کی اشاعت سے بے چینی' افراتفری پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن کی وجہ سے لوگوں میں خواہ مخواہ خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسی چیزیں نہایت ہی برے نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔

بہرحال یہ ایک ایسے کیمپ کی خصوصیت ہے جس کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہیں ہوا یا اس کیمپ کے افراد کے اندر اپنی قیادت کے ساتھ وفاداری ابھی تک مکمل نہیں ہوئی' یا یہ دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی معاشرے میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی تھیں اس لئے کہ اس ابتدائی دور میں اسلامی معاشرے میں ایمان کے اعتبار سے مختلف سطح کے لوگ موجود تھے۔ مختلف فہم و ادراک کے حامل لوگ موجود تھے اور محبت و وفاداری میں بھی یہ لوگ مختلف سطحوں اور درجوں کے تھے۔ غرض اس قسم کی افراتفری اور بے چینی کو قرآن کریم اپنے خالص ربانی منہاج کے مطابق دور کر رہا تھا۔

(وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ (۴ : ۸۳)) (اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں)۔

یعنی اگر یہ لوگ امن اور خوف کی خبریں رسول اللہ ؐ کے گوش گزار کرتے' اس دور میں جب حضور موجود تھے' یا اہل ایمان میں سے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے' جبکہ حضور موجود نہ تھے' تو ان خبروں کی حقیقت یہ لوگ معلوم کر لیتے کیونکہ یہ ایسی چیزوں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان متضاد خبروں کے درمیان سے وہ حقیقت کو اخذ کر لیتے ہیں یا مختلف قسم کے حالات سے وہ بات سمجھ لیتے ہیں۔

ایک مسلم سپاہی کا فریضہ یہ ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خبر سنے تو وہ اسے اپنے افسر تک پہنچا دے بشرطیکہ وہ بھی صحیح افسر ہو'

وہ اس خبر کو اپنے نبی تک پہنچائے اگر وہ موجود ہے اور اگر نبی کا دور ختم ہے تو اپنے اوپر تک پہنچائے۔ یہ رویہ درست نہ ہو گا کہ وہ یہ خبر صرف اپنے ساتھیوں کے اندر پھیلاتا پھرے یا ایسے لوگوں کے درمیان پھیلائے جن پر اسلامی جماعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی قیادت ہوتی ہی وہ ہے جو حقیقت کو سمجھ سکے۔ اور کسی خبر کے نشر کرنے کے صحیح موقع کو بھی سمجھے۔ یہاں تک کہ اگر ثابت بھی ہو جائے تو بھی بعض اوقات کسی خبر کا نشر کرنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کا نشر نہ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

یہ تھی قرآن کی تربیت، قرآن کریم مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی قیادت کے ساتھ وفاداری بھی پیدا کر رہا تھا۔ قرآن نے صرف ایک آیت میں اسلامی فوجی نظام کے تمام اصول جمع کر دیئے بلکہ آیت کے بھی صرف ایک ٹکڑے میں۔ یہ آیت یہ سکھلاتی ہے کہ ایک فوجی مسلسل امن اور خطرے کی خبریں لیتا ہے اور اپنے افسران بالا تک پہنچاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس ایک آیت کی ابتداء میں ایک ایسے فوجی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خبریں لیتا ہے، امن کی بھی اور خوف کی بھی، اور وہ اسے مسلسل شائع کر رہا ہے بغیر سنجیدگی کے اور بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر اس کے کہ اپنی قیادت کے سامنے پیش کر کے ہدایات لے لے۔ آیت کے وسطی حصے میں ایک فوجی کو یہ ہدایت دی جاتی ہے اور آخری حصے میں فوجیوں کے دلی تعلق کو اللہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسے آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجا لائے۔ اسے شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے، جو گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہو تو وہ فوراً دلوں کے اندر فساد پیدا کر دے۔

(وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴:۸۳)) (اگر تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے)۔

یہ ایک آیت ہے اور اس کے اندر علم و معرفت کی وافر مقدار ثبت کر دی گئی ہے۔ اس قضیہ کے تمام پہلوؤں کا ذکر کر دیا گیا، یہ آیت ضمیر کے خفیہ ترین گوشوں تک اتر گئی اور دلوں کے اندر ہدایت اور علم بھر دیا گیا۔ یہ اس لئے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے۔ اور اگر یہ اللہ کی جانب سے نہ ہوتی۔ (لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا) (یہ لوگ اس میں بہت کچھ خلاف بیانیاں پاتے)۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اسلامی صفوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے، ایسی کمزوریاں جو اسلامی معاشرے کی زندگی پر اور عمل جہاد پر اثر انداز ہو سکتی ہیں یہ غلطیاں اور ان کی درستی کا کام اس سبق کے آغاز ہی سے چل رہا ہے۔ اب مسلمانوں کو جہاد و قتال پر ابھارا جاتا ہے جس کا ذکر اس سبق میں ہوتا رہا ہے۔ یہاں آکر حضور اکرمؐ کو ذاتی طور پر قتال فی سبیل اللہ کا مکلف بنایا جاتا ہے۔ اب اس ذاتی ذمہ داری کے بعد کوئی شخص اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ نہ اسلامی جماعت میں پائے جانے والے کسی خلل اور نقص کی وجہ سے نہ راستے کی مشکلات کی وجہ سے۔ اس لئے کہ خطاب صرف ذات رسولؐ کو ہے کہ آپ اٹھیں اور لڑیں اگرچہ اکیلے ہوں اس لئے کہ جہاد ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے۔ آپ بھی اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں، ہاں اپنی ذات کے ساتھ آپؐ اہل ایمان کو بھی قتال پر ابھاریں۔ اللہ تعالیٰ

یہاں اہل ایمان اور آپ ؐ کو فتح و نصرت کی امید دلاتے ہیں اس لئے کہ یہ معرکہ خود اللہ کا معرکہ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زبردست ہے۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾

"پس اے نبی ؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لئے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔"

اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیت کے اندر ہمیں اس وقت کی موجود جماعت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح نظر آتے ہیں، جس طرح ہر دور میں پائے جانے والے انسانی نفوس کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

(الف) ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں کے اندر سخت بے چینی پائی جاتی تھی اور مکمل اتحاد نہ تھا۔ جنگ سے پہلوتہی، اس کی راہ میں رکاوٹیں اور جنگ سے پیچھے رہنے کی کمزوریاں ابھی تک اسلامی صفوں میں موجود تھیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو جہاد پر ابھارنے اور جوش دلانے کی خاطر یہاں نبی ؐ کی ذات مبارک کو حکم دیا گیا کہ آپ جہاد کریں اگرچہ آپ اکیلے ہوں۔ آپ خود اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ آپ مسلمانوں کو بھی ابھاریں لیکن آپ کی ذات کی طرف سے جہاد میں شرکت اس پر موقوف نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کام کے لئے اٹھتے ہیں یا نہیں۔ اگرچہ عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان نبی ؐ کی پکار کو سب کے سب رد کر دیتے لیکن یہاں اس انداز میں کلام کرنے کا مقصد یہ تھا کہ فریضہ بنیادی طور پر آپ پر عائد ہوتا ہے، جس طرح اسلامی تصور حیات کا یہ ایک اساسی اصول ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ کسی ایک کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہ ہوگی۔ ہاں دوسروں کو جنگ کے لئے ابھارنا اپنی جگہ پر ہے۔

(ب) اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشرکین کے ساتھ جنگ چھیڑنے میں لوگ کس قدر خطرات محسوس کرتے تھے اور اس راہ میں کس قدر مشکلات تھیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ کافروں کا زور توڑ دے گا اور اس طرح مسلمان خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحفظ کے زیر سایہ ہوں گے۔ ساتھ ساتھ یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ زبردست قوت والا ہے اور جب وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کی سزا بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ یہ الفاظ کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے گا، اس بات کا مظہر ہیں کہ اس وقت اہل کفر زور آور تھے۔

ان کی قوت کی وجہ سے اسلامی صفوں میں خوف محسوس کیا جاتا تھا اور یہ حالات احد اور خندق کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ احد سے لے کر خندق تک کا دور وہ دور ہے جس میں مدینہ طیبہ کے اندر مسلمان نہایت ہی مشکلات اور خطرات سے دوچار تھے ۔ ان کے اندر منافقین گھسے ہوئے تھے' ان کے اردگرد یہودی پھیلے ہوئے تھے اور ہر وقت مشرکین کو فساد پر آمادہ کرتے رہتے تھے ۔ اور اسلامی صفوں کے اندر اسلامی تصور حیات ابھی تک جاگزیں اور واضح نہ تھا۔

(ج) اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کو مشکلات میں قدم رکھنا ہوتا ہے تو اس کا سارا صرف ذات باری ہوتی ہے اور اللہ کا سایہ عاطفت ہی باعث اطمینان ہوتا ہے ۔ اس وقت صرف اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ ہی پر بھروسہ کام دیتا ہے ۔ جب خطرات اپنی آخری انتاؤں کو چھوتے ہیں اور تمام وسائل کام نہیں کرتے تو پھر ذات باری ہی کام دیتی ہے اور یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن کو اسلامی نظام پیش نظر رکھتا ہے ۔ اس لئے کہ نفس انسانی کا خالق اللہ ہے اور اللہ اپنے پیدا کردہ نفس انسانی کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح اس کی تربیت کی جائے گی اور کس طرح اسے بچایا جائے گا اور کس طرح اسے جوش دلایا جائے گا ۔ اور کس طرح وہ مشکلات کو انگیز کرنے کے لئے تیار ہو گا۔

اس سبق کے آخر میں حضور ؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اہل ایمان کو جنگ پر ابھاریں ۔ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور پیچھے رہنے والوں کا ذکر بھی ہوا تھا ۔ اب یہاں ایک عام اصول بتا دیا جاتا ہے کہ ہر شخص نیکی اور بھلائی کے کام کے لئے سفارش کرے اور لوگوں کو نصیحت کرے ۔ لوگوں کو بھلائی کی ہدایات دے' نصیحت کرے اور بھلائی پر تعاون کی تلقین کرے ۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

"جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا' اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے ۔" اب جو شخص لوگوں کو قتال پر ابھارتا ہے' اس مقصد کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دعوت جہاد دیتا ہے' اسے اس دعوت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے کام کا پورا پورا اجر ملے گا ۔ اور جو شخص پہلوتہی کرتا ہے اور پیچھے رہتا ہے اور اس کے اگر برے نتائج نکلتے ہیں تو یہ شخص بھی ذمہ دار ہے ۔ "کفل" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیچھے رہنے والا نتائج بد کا ذمہ دار ہو گا۔

اسی اصول کا اطلاق ہر اچھی سفارش پر ہو گا اور بری سفارش پر بھی یہی اصول منطبق ہو گا۔ اگرچہ یہ اصول خاص حالات کے اندر ذکر ہوا ہے لیکن یہ قرآن کریم کا انداز بیان ہے کہ وہ ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور اس جزئی واقعہ کو بھی اس قاعدہ کلیہ کے ایک جزو کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر تمام امور کو ذات باری سے مربوط کر دیتا ہے جو ہر چیز کا نگہبان اور رازق ہے۔ جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور لفظ (مقیت) میں یہ مفاہیم داخل ہیں۔

(وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (۴:۸۵) (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے) اچھے کاموں کی سفارش کے بعد یہ کہا جاتا ہے اگر کوئی تمہیں سلام کرے تو یا تو اس سلام جیسا جواب دو یا اس سے اچھا جواب دو۔ کسی بھی معاشرے میں سلام ایک ایسا فعل ہے جس سے زندگی کی گاڑی نہایت ہی سکون اور سہولت کے ساتھ چلتی ہے اگر د آداب سلام کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے۔ سلام اور اچھائی کی سفارش کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں دو فرد ایک دوسرے کو سلام ہی نہیں کرتے تو وہ ایک دوسرے کو مزید کیا ہدایت دیں گے۔

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾

"اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر طریقے سے جواب دو یا کم از کم اسی طرح لوٹا دو' اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

اسلام نے اپنا ایک خاص سلام اسلامی معاشرے کو دیا۔ جس سے ایک مسلمان اور مسلمان معاشرہ غیر مسلم اور غیر مسلم معاشروں سے ممتاز ہو گیا۔ یہ سلام ایک مسلمان کو بالکل منفرد اور متمیز بنا دیتا ہے' وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں ممتاز صفات کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے دوسرے معاشروں میں مدغم اور گھل مل نہیں جاتا' نہ کان نمک میں نمک بن جاتا ہے۔

اسلام نے تین الفاظ دیئے ہیں۔ السلام علیکم' السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' اور جواب سلام یا تو ویسا ہو گا یا اس سے زیادہ ہو گا ماسوائے تیسرے لفظ کے۔ مثلاً السلام علیکم کا جواب یا تو علیکم السلام ہے یا اس سے بہتر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ دوسرے لفظ پر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہو گا۔ اور تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں الفاظ پورے استعمال ہو گئے۔ اس لئے تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ حضور ؐ سے ایسی ہی روایت ہے۔

اس میں ایک تو وہ انفرادیت ہے' جو اسلامی معاشرے کا خاص رنگ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کے خاص خدوخال ہوں' ان کی خاص عادات ہوں' جس طرح اسلام نے ایک مخصوص قانونی تنظیمی نظام دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم تحویل قبلہ کے موقعے پر بات کر آئے ہیں کہ اسلام نے اس امت کو جس طرح ایک نظریہ حیات دیا ہے' اسی طرح اسے ایک مخصوص قبلہ بھی دیا ہے۔ (دیکھئے سورت بقرہ پارہ دوئم)

دوسری یہ کہ اسلام نے امت مسلمہ کے افراد کے اندر نہایت پختہ محبت اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سلام کا عام کرنا' اور سلام کا جواب سلام سے زیادہ اچھا ہو اور دوسرے تعلقات جن کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی کے اندر نہایت ہی پختہ روابط اخوت و مودت پیدا ہوئے۔ حضور ؐ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اچھا ہے؟ تو آپ ؐ نے جواب دیا "یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور چاہے جاننے والا ہو یا نہ جاننے والا ہو' اسے سلام کرو۔" یہ تو حکم ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر سلام کرو' اور یہ سنت ہے' رہا سلام کا جواب تو وہ اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ اسلامی معاشرے میں سلام کرنے کی عادت کے اثرات کا اندازہ عملاً اس وقت ہوتا ہے جب سلام کے ذریعے غیر متعارف لوگ باہم متعارف ہو کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو لوگ ایک دوسرے کو علیک سلیک کرتے رہتے ہیں ان کے باہم روابط قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو ہر اس شخص پر ظاہر ہو جاتی ہے جو اس عادت کے آثار کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ آیات قتال کے درمیان میں باہم دوستانہ تعلقات کے لئے یہ آیت باد نسیم ہے اور اس میں اسلام کے اصل الاصول کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ملک کے اندر امن و امان قائم ہو' اس لئے کہ اسلام دین امن ہے۔ اسلام کی جنگ بھی دراصل امن کے لئے ہے یعنی کرۂ ارض پر امن قائم کرنا۔ اور یہ امن وسیع معنوں میں مطلوب ہے۔ ایسا امن جو اسلامی نظام حیات پر مبنی ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۷ ۳ ایک نظر میں

اس سبق میں اسلامی تصور حیات کے ایک بنیادی اصول کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی عقیدۂ توحید اور اللہ تعالیٰ کو اس کی حاکمیت میں وحدہ لاشریک سمجھنا۔ پھر اس اصول کے مطابق اسلامی سوسائٹی اور اسلامی معاشرے کے تعلقات دوسرے کیمپوں کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں لیکن دوسرے معاشروں کے ساتھ اسلامی معاشرے کے تعلق کی نوعیت کے تعین سے بھی پہلے اس سبق میں خود مسلمانوں پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ منافقین مدینہ میں رہنے والے منافقین سے کوئی علیحدہ گروہ تھا۔ یہ احکام اسلام کے اصل الاصول پر قائم ہیں اور یہ تنقید بھی اسی اصول کے مطابق ہے جس پر اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام قائم ہے۔ اس اصول کا ذکر ہر وقت ہوتا رہتا ہے جب بھی اسلامی نظام کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی قانون سازی کی جاتی ہے۔

یہ احکام مختلف کیمپوں کے بارے میں ہیں اور یہ احکام ان اصول و قوانین کا حصہ ہیں جسے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے متعارف کرایا۔ ان قوانین کا تعلق قانون 'بین الاقوام' سے ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے بین الاقوامی معاملات میں تلوار کے فیصلے سے ہٹ کر کچھ قواعد بنائے۔ قوت کی دلیل اور جنگل کے قانون پر مشتمل بین الاقوامی رولز میں اسلام نے سب سے پہلے مہذب ضابطے پیش کئے۔

یورپ کے اندر قانون بین الاقوام کا آغاز صرف سترہویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) میں ہوا لیکن یہ قانون ماسوائے کاغذ اور سیاہی کے اور کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور جو بین الاقوامی ادارے تشکیل دیئے گئے تھے' وہ محض بین الاقوامی استعماری قوتوں کے خفیہ مقاصد کو قانونی شکل دینے کے آلہ کار تھے۔ نیز یہ ادارے سرد جنگ کے لئے میدان کارزار تھے۔ ان کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ حق حقدار تک پہنچے۔ نہ یہ ادارے صحیح معنوں میں انصاف کرتے تھے۔ یہ ادارے وجود میں محض اس لئے لائے گئے تھے کہ اس دنیا میں بعض بڑے اور طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ممالک کے درمیان کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جونہی ان ممالک کے مابین طاقت کا توازن ختم ہوا تو نہ ان بین الاقوامی قوانین کی کوئی حیثیت رہی اور نہ ہی ان بین الاقوامی اداروں کی کوئی قیمت رہی۔

جب اسلام آیا' جو انسانوں کے لئے رب ذوالجلال کا نظام زندگی ہے تو اس نے ساتویں صدی عیسوی میں بین الاقوامی معاملات کے اندر قانون سازی کی' یعنی پہلی صدی ہجری میں۔ یہ قانون اسلام نے از خود وضع کیا اور اس قانون کے بنانے کے لئے کسی ہم پلہ حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہ تھا۔ یہ قانون اسلام نے از خود بنایا اور از خود اس پر عمل کیا تاکہ اسلامی معاشرہ اس کی بنیاد پر دوسرے کیمپوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرے' انسانیت کے لئے انصاف کے جھنڈے بلند کرے اور اس کے لئے نشانات راہ متعین کرے۔ اگرچہ اس دور کے جاہلی دشمن کیمپ مسلمانوں کے ساتھ ان اسلامی بین الاقوامی

قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ نہ کرتے تھے اس لئے کہ یہ اصول اور قوانین اسلام نے پہلی مرتبہ متعارف کرائے تھے ۔ یہ بین القوامی قوانین قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کو یکجا کیا جائے تو بین الاقوامی قانون کا ایک مکمل ضابطہ سامنے آتا ہے ۔ اس کے اندر ان تمام حالات کا حل موجود ہے جو کسی بھی وقت اسلامی مملکت اور دوسرے ممالک کو پیش آسکتے تھے ۔ چاہے یہ ممالک بر سرجنگ اور محارب ہوں، پرامن ہوں، مخالف ہوں، غیر جانبدار ہوں، محارب کے حلیف ہوں، پرامن معاہد کے حلیف یا مخالف اور غیر جانبدار کے حلیف ہوں ۔

یہاں ان اصولوں اور احکام کی تفصیلات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس قسم کی تفصیلی بحث تو بین الاقوامی قوانین کے ماہرین کا کام ہے ۔ البتہ ان آیات کے اندر جو اصول آئے ہیں ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ۔ اس سبق میں درج ذیل لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے ۔

(الف) وہ منافقین جو مدینہ میں مقیم نہ تھے ۔

(ب) وہ لوگ جو ایسی قوم سے متعلق ہیں جس کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی میثاق ہے ۔

(ج) وہ غیر جانبدار لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا بھی پسند نہیں کرتے اور خود اپنی قوم کے ساتھ مل کر بھی لڑنا پسند نہیں کرتے لیکن وہ ہیں اپنے سابق دین پر ۔

(د) وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کھیلتے ہیں ۔ جب مدینہ آتے ہیں تو اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور جب مکہ کو جاتے ہیں تو کفر کا اعلان کرتے ہیں ۔

(ہ) مسلمانوں کے اندر قتل خطا اور مختلف لوگوں یعنی مختلف شہریت کے مالک لوگوں کے مابین قتل عمد کے واقعات میں ضابطہ ۔ ان تمام حالات میں ہمیں واضح احکام ملتے ہیں جو اپنے موضوع پر بالکل صریح ہیں ۔ اور تمام حالات پر ان کا انطباق ہوتا ہے ۔ اور یہ اصول بین الاقوامی معاملات کی ضابطہ بندی کا ایک حصہ ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو اس موضوع پر دوسرے احکام بین الاقوام کا ہے ۔

---ooo---